

گلے قرین

قیر کا طلب سلیپ ٹھانے

آرکیمیرزا



”کھنی سنی“

کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے اگر اس کے ساتھ کوئی نیکی کر لے تو اس کے معاوضے کے لئے سالہا سال بھی تیار نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی بُرائی کی جائے تو جلد از جلد انتقام لینا چاہتا ہے۔ بدی کے ثقافات کا جذبہ اس کے دل میں بہت جلدی پیدا ہوتا ہے اور بُری طرح پیدا ہوتا ہے انتقام کا جن اس کے حواس کو باطل کر دیتا ہے آسانی فرشتے ”واغفو وأصلصخوا“ کی صدا بلند کرتے ہیں اور والٹکاظمین الغیظ کے لہرے لگاتے ہیں لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

بس اس کا میلان انتقام کی طرف اکساتا رہتا ہے اور یوں یہ سلسلہ سا چل لگتا ہے جو کبھی صدیوں تک بھی چلتا ہے یوں انتقام لینے والا بُرائی کرنے والے سے زیادہ بدتر بن ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو انتقام لینے کے بعد روح کو قہر نہیں آتا۔ وہ مسرت نہیں ملتی۔ جس کی اسے طلب ہوتی ہے۔ وہ پورا انتقام نہ لے کر بھی ایک اضطرابی اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور پورا انتقام لے کر کچھتاوے کی آگ اسے جھین نہیں لینے دیتی۔ لہٰذا انتقامی کارروائی ایسا زہریلا مادہ ہے جو خود اپنے اوپر ہی اثر کرتا ہے اس سے بچنا چاہئے۔ اور یقین کریں میں نے آج تک انتقام لینے والے کو کبھی آسودہ اور مطمئن نہیں دیکھا۔ آسودگی اور طمانیت بھلا اور درگزر میں ہے اگر لوگوں کو بھرپور تحمل کی عادت ہو جائے تبھی وہ واقف ہو جائیں گے۔

در عفو لذت نیست کہ در انتقام نیست

ایک جنگ میں حضرت علیؑ اپنے دشمن کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ قریب تھا کہ اسے خنجر سے قتل کر دیں کہ دشمن نے آپ کے روئے مبارک پر ٹھوک دیا، آپ فوراً اس کے سینے سے اتر آئے دشمن نے اس غیر متوقع اور بے گل ہمدردی کی وجہ دریافت کی تو۔ آپ نے فرمایا: پہلے تم سے خدا کے لیے دشمنی تھی۔ اب ذاتی غصہ اور انتقام کا نتیجہ ہوئی۔ عفو اسلامی کی اس مثال سے وہ شخص مسلمان ہو کر کفار کے ساتھ لڑتا رہا۔

یہ کتاب میر کی ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ انتقام کا سفر ایک مسلسل اذیت کا سفر ہے آپ انتقام لے رہے ہیں یا لینے کا سوچ رہے ہیں دونوں حالتوں میں بے کوئی آپ کا مقدر بن جاتی ہے۔ دنیا بہت مختصر ہے اسے آگ کی نذر کرنے کی بجائے محبت کے لہلہا نہ کھیت بنائے۔ محبت کا بیج بو کر دیکھئے۔ چھاؤں بھرا درخت اُگتا چلا جائے گا۔

زیر مطالعہ ڈالی ”تیری طلب کے سیپ اٹھائے“ ماہنامہ آن لائن کراچی میں قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔..... اس کی پسند اور ناپسند کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے ”تیری طلب کے سیپ اٹھائے“ کے بارے میں اپنی تنقیدی اور تقریری آراء سے (معرفت پبلشر) ارسال فرمائیں گے؟

مخلص

آسیہ مرزا

کھٹناک سے دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ایزل سے نظریں ہٹا کر دروازے کی
ست دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے پروا انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔
”کتنی دفعہ کہا ہے دروازہ ناک کر کے آیا کرو۔“
اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے برش ٹرے میں رکھ دیا۔
”اور کتنی دفعہ کہوں کہ اس طرح بغیر ناک کئے آنے میں کیا قباحت ہے آخر؟“
وہ اطمینان سے بولی۔ پھر مسکین سی صورت بنا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔
”سوری عمر بھائی۔ چنانہیں کیوں میں ہر بار آپ کی تاکید بھول جاتی ہوں۔ شاید
یادداشت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اسی لئے تو امی کہتی رہتی ہیں حریرہ پیا کرو۔“
اس کی آنکھوں کی تہوں میں شرارت چل رہی تھی اور خوش نما ہونٹوں پر معصوم سی
مسکراہٹ بھی۔

اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ البتہ اسی سنجیدگی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”کیا کام ہے؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟“

”آپ بھول گئے۔ میں نے رات فون پر آپ کو بتایا تھا۔“ وہ اس کی بے خبری پر برامان کر بولی۔ مگر وہ ہنوز انجان بلکہ غائب و نامنی سے کھڑا اسے تسکرا رہا۔

”افوہ۔ بتایا تو تھا کہ ہمارے کانچ میں اسٹوڈنٹ ویک منایا جا رہا ہے اور اس میں سب ہی اپنے اپنے مہمان لارہی ہیں۔ میرے ساتھ می اور پاپا تو نہیں آئیں گے۔ لازماً آپ کو آنا ہے۔ بلکہ ہر حال میں۔ دیکھیں میں انکار نہیں سنوں گی۔“ اس نے اسے مزید بولنے سے ٹوک دیا۔

”میں نے تم سے غالباً فون پر ہی معذرت کر لی تھی۔ کیا کمی ہے تمہارے پاس لوگوں کی۔ دو دو ہیال بھرا پڑا ہے تمہارا۔ رنگ برنگے لوگوں سے“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”مجھے ان رنگ برنگے لوگوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس میں آپ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کے صاف ستھرے کھڑے کھڑے بیڈ پر پاؤں چڑھا کر بیٹھ گئی اور ٹکیہ گود میں دبالی۔ گویا اس کا کھٹکے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی اس بے وقت کی مداخلت پر ڈسٹرب ہوا تھا اور اسے وہ ہنستھی ایسے کام پر جو اسے کم از کم وقت کا زیاں اور اپنے مزاج کے خلاف دکھائی دے رہا تھا۔

”عینیہ پلیز!“

”نو پلیز!“ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا دیا۔ پھر ٹکیہ اپنے آگے زور سے پٹخ کر اس پر مکا مارتے ہوئے بولی۔ ”آخر آپ میری بات مانتے کیوں نہیں ہیں۔ کبھی ٹھیک ہے آپ نہیں آتے تو نہ آئیں۔ میں بھی نہیں جاتی۔ بھلے سے میری فرینڈز مجھے قتل کر دیں۔“

وہ اس کی ہچکناہت پر مسکرا کر رہ گیا۔

”میری ساری فرینڈز آپ سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ اسی لئے تو میں آپ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“ وہ دونوں پیر بیڈ سے لٹکا کر بیٹھ گئی اور ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے انہیں بتایا تھا کہ آپ ایک بہترین مصور ہیں۔ فاریہ آپ کی تصاویر کی نمائش انجرا میں دیکھ چکی ہے تب سے وہ غائبانہ آپ سے انتہائی متاثر ہو بیٹھی ہے۔“

عینیہ کی یہ باتیں اس کے لئے کسی قسم کی خوشی و مسرت کا باعث نہ تھیں۔

”آپ کو پتا ہے لڑکیاں تو اپنے کزنز کو شومارے کے لئے لے آتی ہیں۔ ایمان سے عمر بھائی۔ آپ میرے ساتھ آئیں گے تا تو یہ فاری لوگ تو جمل کر رہ جائیں گی۔“

”تو تم کیوں جلا نا چاہتی ہو انہیں۔“ وہ اسکی کسی بات کو سیریس نہ لے رہا تھا۔ وہ برامان کر انہیں گھورنے لگی۔ پھر پلکیں جھپک کر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

”ایک بار وہ بھی اپنے سڑے سے کزن کو لے کر آئی تھی اور خوب شامارتی رہی تھی۔ آپ تو اتنے ڈیٹسٹ۔ اتنے امارت ہیں۔ کیا میرا ذرا بھی حق نہیں بنتا شو آف کرنے کا۔“

پتا نہیں وہ اس کی اتنی دیوانی کیوں تھی۔ اسے تو عمر کے چلنے کا بیٹھنے کا مسکرانے کا ہر ہر انداز پسند تھا۔ نہ جانے وہ کون کون سی خوبیاں اسکی بیان کرتی۔ مگر وہ قطعاً خوش نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی بچپن کے بوائے سب اب اندر سے تناور درخت بن چکے تھے۔ خوش فہمی کا کوئی جھونکا اسے نہیں جھنجھوڑتا تھا۔

”تم فہد کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی کزن ہے تمہارا۔ اور پھر اسے اس طرح کے فنکشن اٹینڈ کرنے کا تجربہ بھی ہے اور اس طرح کی گید رنگ وہ پسند بھی کرتا ہے۔ اسے انجوائے کرتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ تم بھی انجوائے کرو گی۔“ وہ دراز کھول کر سگریٹ کا

اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ میرا خیال ہے آپ نے زندگی میں پہلی بار میرا مان رکھا ہے۔ میں کس قدر خوش ہوں آپ شاید اندازہ نہیں کر سکتے۔ تھینک یو عمر بھائی۔“

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اور وہ ہونٹ میچھنے دروازے کو تکتا رہ گیا۔



راستے بھر وہ اس کے کان کھاتی رہی پھر کسٹ پلیئر میں کسٹ اٹھا کر لگا دی۔ ”کیا کر رہی ہو۔ بند کرو اسے۔“ وہ اسے ڈانٹنے لگا مگر ہنوز اس غزل کی طرف متوجہ رہی۔

ع کون کہتا ہے محبت کی زبان ہوتی ہے

یہ حقیقت تو نگاہوں سے بیان ہوتی ہے

وہ نہ آنس تو ستاتی ہے خلش سی دل کو

وہ جو آنس تو خلش اور جواں ہوتی ہے

عینہ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا تھا مگر اسے لگا خود اس کا اطمینان کھڑ گیا

ہو۔ اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر آف کرنا چاہا تو وہ بقیہ ہو کر جلدی سے بولی۔

”رہنے دیں نا پلیز۔“ پھر دھیرے سے بولی۔ ”مجھے بھی تو پتا چلے آپ کی چوئس

کا۔ آپ تو اس بند کتاب کی طرح ہیں جو کھلتی ہی نہیں ہے“ جیسے کوئی پرسل ڈانری۔ جسے کھولنے کی کوئی ہمت نہ کر سکے۔“

اس کا ہاتھ ٹھٹک کر رہ گیا وہ بے ارادہ ہی اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جو کیسٹ سے نکلنے والی غزل میں محو تھی۔ یا پھر دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ مگر اسے لگا جیسے

پیکٹ تلاش کرنے لگا اور جو نبی پیکٹ اٹھانے لگا اس نے لپک کر وہ جھپٹ لیا اور جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اچھی طرح واقف تھی یہ شے اس شخص کی کمزوری تھی۔

”عینہ پلیز۔ تنگ نہ کرو۔“ وہ جیسے عاجز آ گیا۔

کچھ ہتھلاہٹ اس کے چہرے پر بھی سٹ آئی۔ وہ کھل کھلا پڑی۔

شفاف تر و تازہ اور نگفتہ ہنسی نے لفظ بھر کے لئے کمرے کے سکوت میں ہلچل مچا دی۔ اس خوبصورت ہنسی نے مسور کن فضا تان دی۔

”فہدی کو لے جانا ہوتا تو میں آپ کا سر کیوں کھا رہی ہوتی۔ وہ میری فریڈنز سے الٹی سیدیگی کا بوس کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے نہیں لے جانا اسے۔“

پتا نہیں کیوں اسے گور سے پنے فہد میں کوئی متاثر کن بات نہیں لگتی تھی۔ یہ تو امی ہی تھیں جو اس کے گیت الاپتی رہتی تھیں۔ اس کی گھر آنے پر خاطر مدارت کرنے بیٹھ جاتیں۔ ان کا بس چلنا تو آسمان کے تارے تو ڈکراس کے قدموں میں بچھا دیتیں۔

”فہد صرف شرارتی ہے۔ یقین کر دو تم اس کے ساتھ انجوائے کرو گی۔“

”ضرور کروں گی۔ مگر میں کل آپ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے ضدی لہجے

میں کہا۔

”اچھا۔ بابا جیسی تمہاری مرضی۔ اب یہ پیکٹ تو ادھر دو۔“ اس نے ہتھلا کر رضا

مند دی دے دی اور ہاتھ آگے کر دیا جس پر اس نے ہستے ہوئے اور تھینک یو کے ساتھ سگریٹ کا پیکٹ رکھ دیا۔ اور پھر ایک گہری طویل قسم کی سانس بھرتے ہوئی بولی۔

”میں تو سوچ رہی تھی کہ ناؤ کا تعاون حاصل کرنا پڑے گا۔ اس پورے گھر میں

آپ ایک انہمی کی بات تو مانتے ہیں اور کچھ کچھ تیور ماموں کی۔“ وہ اس کی سمت شرارت

آ میز انداز میں دیکھ رہی تھی پھر اسکی جان چھوڑتے ہوئے احسان کرنے والے انداز میں

وہ دل ہی دل میں ہنس رہی ہو۔

”ماپوسی ہو گئی تمہیں۔ میری چو اُس جان کر۔“ وہ اسکا بقیہ جملہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ اور آہستگی سے مٹن آف کر دیا۔ جبکہ وہ انکی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔

”آپ کی چو اُس آپ کی طرح لا جواب ہے۔“

”میں ایسی باتوں پر خوش نہیں ہوتا۔ میں حقیقت پسند ہوں اور حقیقت ہمیں کوئی بتاتا نہیں ہے وہ خود ہمیں نظر آتی ہے اپنی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ۔“ اس کا لہجہ انتہائی کرخت ہو گیا۔ ایسی ہی کرنٹنگی اس کے چہرے پر بھی ایک بیک بھیلی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ عینیہ نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس طرح الجھ جاتی جب وہ اپنی تعریف پر اسی طرح کے رد عمل کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی جھلکنے لگتی اور اس برہمی میں سرخی واضح ہوتی۔

جبکہ اپنی ہنسی مصنوعی تعریف پر بھی سینہ تان لیتا تھا۔ گردن اکڑا کر فرضی کارل جھاڑ لگتا تھا۔ اور تعریف کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا تھا۔

اس نے چورنگا ہوں سے اسے دیکھا۔ بلیک ٹراڈ زرو ہائٹ شرٹ میں وہ خاصا جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا اسکی ساری کشش آنکھوں میں تھی۔ گہری سنجیدہ تین ذہین آنکھیں۔ جسے وہ عادت کے مطابق ہلکی جھنک دیکر مسکرایا کرتا تھا۔ اور ایسے میں اس کی شخصیت میں ایسی دلکشی سمٹ آتی جو عینیہ کو اپنے دل پر قم ہوئی محسوس ہوتی۔

اس کا پورا گروپ چھ شرارتی لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ جو کالج کا ذہن ترین اور حاضر جواب گروپ مانا جاتا تھا۔ تعلیمی میدان میں اول تھا ہی ان سے بہت کر دوسری سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ آگے رہتا تھا۔

وہ عمر کے ساتھ گاڑی سے اتری تو اس کا پورا گروپ دو دروازے پر ہی اس کے استقبال کو کھڑا تھا۔ عمر کچھ جبکہ سا گیا۔ فطرتاً وہ کم گو اور شرمیلا تھا۔ لڑکیوں سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہ رکھتا تھا۔ اسٹوڈنٹ لائف میں بھی وہ ہمیشہ الگ تھلک رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کم آئیز تھا یا پھر اس کے بچپن کا کوئی کمپلیکس اس کے ہمراہ رہا تھا۔

سیاہ اور سرخ کنٹراس کے ہلکی ایمبرائیڈری والے سوٹ میں عینیہ پر یوں جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی سے اتر کر چلتا ہوا خود کو غیر اعتماد محسوس کرنے لگا۔ عجیب سی بے آرامی اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

”چمن ہنس پڑے“ اور گل مسکرائے

”بوا شکریہ آپ تشریف لائے۔“

وہ پورا گروپ ان کے گرد جمع ہو گیا۔ سب کی نظریں عینیہ کے ویل ڈریس‘ اسارت کزن پر تھیں۔ جو باوجود دراز قد ہونے کے ان نازک نازک کامی مگر شرارتی لڑکیوں کے گھیرے میں آکر خود کو کچھ پریشان سا محسوس کرنے لگا تھا اور وہ سب تھیں بھی ایک سے ایک پناخ۔

عینیہ نے ایمن ملوی کا تعارف کرایا جس نے عمر کو دیکھتے ہی شعر پڑھا تھا۔

”یہ ایمن ہے۔ اسے شاعری کا خط ہے۔ ابھی آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں۔“ اس نے بنگ سوٹ پر سفید کڑائی والے دوپٹے میں ملبوس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ستم تو یہ ہے کہ ظالم خن شناس نہیں وہ اک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اس نے گویا اپنے اس خبا کا مزید ثبوت پیش کیا اور جبکہ کرکورش بجالائی۔ ہر طرف کھل کھلا ہنسیں بکھر گئیں۔

”یہ فار یہ احمد ہے جو اچھی اچھی کتابوں اور خوبصورت تصویروں کی دیوانی ہے۔“
 ”تصویروں کی ہی نہیں تصویر بنانے والوں کی بھی۔“ اس نے جواباً عینہ کو شہو کا مارا
 اور فدیہ یا نانداز میں عمر کو دیکھنے لگی۔ وہ تجل سا ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔
 ”یہ راجہ رضایاں ہمارے گروپ کی سب سے کم گو۔“ اس نے فار یہ کو چنگلی بھر کر
 مزید تعارف کا مرحلہ آگے بڑھایا۔

”اب اتنی کم گو بھی نہیں ہیں۔“ بقول شاعر

یہ اور بات ہے کہ ممبر پہ آ کے کچھ نہ کہیں

خاموش لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں

ایمن کی چلبلی فطرت اسے بولنے سے باز نہ رکھ سکی۔ ایک بار پھر اس شریر گروپ
 کی کھل کھلا بیس عمر کے ارد گرد کھڑے گئیں۔ اگر اس وقت فہد ہوتا تو یقیناً انجوائے کرتا۔ مگر وہ
 اپنی فطرت کے خلاف یہ سب برداشت کر رہا تھا۔

”اور یہ میمونہ قریشی میں عرف مونا۔ کھانے پینے کی از حد شوقین اور نیند کی رسیا۔“
 اس نے ایک صحت مند لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا فربہ مائل سراپا از خود اس کے
 دونوں شوق کا ترجمان تھا۔

”یہ عموماً این انشاء کے اس شعر کی تفسیر نظر آتی ہیں۔“

نیند ہی نیند ہے آنکھوں میں

اب ہم کو نہ اٹھانا لوگو

”ایم کی بچی۔ تو چسکی نہیں رہے گی۔“ مونانے اسکے بازو میں اپنی مضبوط صحت
 مندا انگلیاں گاڑ دیں۔

وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور عمر کا خیال تھا وہ برا پھنسا تھا۔ اس کا ضبط

جواب دے رہا تھا۔

”یعنی اب ان کا تعارف بھی تو کر آؤنا۔“ فار یہ اس کے خاموش ہونے پر بولی۔
 تو اس نے بے ساختہ نظر میں عمر پر جمادیں۔ اس کے لبوں کی تراش میں مدہم سی مسکراہٹ
 نکھر گئی۔ عجب سا خنار آنکھوں میں بلکروے لیے لگا۔ پھر دھیمے آج دیتے لہجے میں بول۔

ع تم نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ

زندگی جس کے تصور میں لٹا دی ہے ہم نے

اس کا لہجہ خمار آلود تھا۔ آلودہوں میں والہانہ چمک لیے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
 وہ اس لمحے وہ یقیناً فراموش کر گئی تھی کہ وہ اس وقت کہاں کھڑی ہے۔ کن کے
 درمیان۔ پورا گروپ اوٹے اوٹے کرنے لگا۔ جبکہ عمر کو لگا اس کے ارد گرد بجلیاں کرکڑ گئی
 ہوں۔ اس کے اعصاب پر زبردست پتھر پڑا تھا۔ اس کی پیشانی یوں جل اٹھی جیسے کسی نے
 جھڑکتے ہوئے شعلوں میں اسے قہلیل دیا ہو۔

تم پر ابھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں

تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ایک خود فراموشی اور دلفانی کے عالم وہ اسے نکلے جاری تھی تب وہ ہونٹ بھیج کر
 آگے آیا پھر نہ جانے کیسے اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

وہ عالم مدہوش سے عالم خود شای میں چلی آئی تذلیل کے احساس نے اس
 کا چہرہ اور بھی سرخ کر ڈالا۔

”تمہارے ساتھ آ کر میں نے شاید بہت بڑی حماقت کی ہے۔“ وہ اسی اشتعال
 میں ایزیوں کے بل پلٹا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ دم سادھے وہ اس تذلیل پر ششدر سی کھڑی رہی۔ ہوش آیا تو گیٹ کی طرف

بے ساختہ بھاگی مگر وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور بے حد دردش انداز میں ریورس کر کے سڑک پر دوڑانے لگا۔

اب وہاں مٹی کا بگولا تھا جو فضا میں تحلیل ہو رہا تھا وہ ذلت آمیز کرب میں ڈوبی وہیں کھڑی رہ گئی رخسار الگ سنگ رہا تھا۔

اسے عمر سے ایسے رویے کی امید ہرگز نہ تھی۔ اتنے خنڈے بیٹھے مزاج کا آدمی ایسا رویہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ یوں بھرے مجمع میں اس کی تذلیل کر سکتا تھا۔ وہ حیرت میں مری جا رہی تھی۔

اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ واپس اپنے گروپ کی طرف پلٹتی۔ اس کی خوش نما آنکھیں یکا یک پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے لب بھینچ کر اس پانی کو پلکوں کی مضبوط باڑھ کے سہارے روکنا چاہا۔

”اب یہیں کھڑی کیا سوگ مناتی رہو گی؟“

وہ ہلٹی تو ایمن اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے پلٹنے پر اس کی بھیگی آنکھوں اور سرخ چہرے کو دیکھ کر اس کا کندھا تھکتے ہوئے بولی۔

”ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی تو قے کے خلاف۔ شاید وہ غصے کے تیز ہوں گے۔“ اس نے پلکیں جھکا دیں۔ ہپ۔ ہپ۔ ہپ۔ کئی آنسو خراکار پلکوں کی باڑھ تو ذکر تپتے ہوئے رخساروں پر کرشٹل کے موتیوں کی طرح نکھر گئے۔

”وہ غصے کے تیز نہیں ہیں ایمن۔ تبھی تو مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ وہ ایسے تو نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

ایمن نے اس کے گرد اپنا بازو ڈال دیا۔

”جو اچھے لگتے ہیں نا جنہیں ہم دل و جان سے چاہتے ہیں ان کی ساری کج

ادائیاں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے اس وقت کی واردات کو بھول جاؤ۔ شاید انہیں اپنے کزن ہونے کا زیادہ احساس تھا اسی وجہ سے تمہاری یہ جرات اور وہ بھی گھر سے باہر برداشت نہ کر سکے۔“ ایمن نے اسے دلاسا دیا تو اس نے سر جھکا لیا۔

”پتا نہیں۔ بس یہ شخص کبھی کبھی یونہی میری سمجھ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں انہیں کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی“ وہ کندھے پر لٹکتے بیک سے ٹشو نکال کر ناک رگڑنے لگی۔ ایمن ہنس پڑی۔

وہ ایمن کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی۔

”وہ شخص تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے“ تمہاری دسترس سے بہت دور دکھائی دیتا ہے۔ یہی تو وہ شعلہ ہے جس پر تم لپک رہی ہو جو شے دسترس سے باہر ہوتی ہے اسی میں تو کشش ہوتی ہے۔

اس کے رخساروں پر سرخی سہم آئی اور ایمن کھل کھلا پڑی۔

”چلو اب اس بندے کو زیادہ سچڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خبردار اس سے بات مت کرنا۔ اب یہ اس کا فرض ہے کہ وہ تم سے معذرت کرے۔“

پھر وہ آنکھیں میچا تے پھر معنی جیز تسم کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئی کنگنائی۔

اس کو کچھ تو بتا دیا ہے

تم نے تھوڑا سا دھیان دے کر

وہ بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکی تھی۔

”ایمی کی بچی پوری خبیث ہے تو۔“ وہ زور زور سے اس پر کئے برسانے لگی اور

ایمن نے جلدی سے اسی کا شولڈر بیک بطور حفاظتی اقدام کے اپنے آگے رکھ لیا۔



اس نے برش ایک طرف ڈال دیا۔ اور بے زار نظروں سے اپنی ادھوری بینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ ایک لخت دل چاہا باز اس بارش اٹھا کر سیاہ رنگ میں ڈبو کر اسے بگاڑ دے۔
ہر چیز جس جس کر دے۔

سارے رنگ اس پر اغیل دے۔

یا بھر۔

اس کو ایزل سے اتار کر کٹوے کٹوے کر دے۔

مگر دوسرے پل اشتعال انگیز جذبہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اس نے اضطرابی انداز میں ایزل کا پردہ گرادیا۔

وہ دورا ہا بھی آ گیا احمد

جس کا دھڑکا تھا ابتداء سے ہی

اس کے اندر اضطراب کی لہریں پھوٹ پڑیں۔ وہ نادان یا کم فہم نہیں تھا کہ آنکھوں کے وہ رنگ نہ پچھانتا جو عینہ کی آنکھوں کے اندر نکھرے ہوئے تھے۔
وہ جذبہ جوشل مہتاب دل کے آسمان سے ابھرتا ہے اور آنکھوں میں شفق بن کر نکھر جاتا ہے۔

ایسی ہی شفق اس نے عینہ کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔

وہ سخت مضطرب ہو رہا تھا۔ جس حد شے کی آہٹ محسوس کر رہا تھا وہ بے حد زرد یک جلا آیا تھا۔

اس کے اندر جیسے پت جھڑکا موسم اترنے لگا۔ دماغ انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔

ہر سوچ میں ذہن بن کر لگ رہی تھی۔

وہ اپنی ہی سوچوں کے اس زیروم سے گھیرا کر کمرے سے نکل آیا۔ جہاں ایک پر

روشن دنیا آباد تھی۔ پتا نہیں اس کے لئے قہمی یا نہیں۔

صغریٰ (ملازمہ لڑکی) نے اسے شام کی چائے دی تو وہ گگ لیے اماں جان کے کمرے میں چلا آیا۔

”چلو تمہاری بھی شکل نظر آئی۔ ترس جاتی ہوں میں تو تمہاری صورت دیکھنے کو۔“ وہ اسے دیکھتے ہی بولیں اور اس نے عادت کے مطابق صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور ان کے تحت پران سے لگ کر بیٹھ گیا۔

”ایک دن ہی تو چھٹی کا ہوتا ہے دادی جان۔“

”اور وہ بھی۔ تم کمرے میں بند ہو کر گزار دیجئے۔ تم عمر یونہی میرا دل جلاتے رہو نا۔“ انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ دی اور صغریٰ کے ہاتھ سے چائے کا گگ تھام لیا۔

”میں تو پوری کوشش کرتا ہوں دادی جان کہ آپ کا دل نہ جلے۔“ وہ نرم بیچھے میں

بولتا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“ اماں جان نے اسے گھور کر دیکھا وہ چائے کے گگ سے اٹھتے دھواں پر نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔

”آپ جانتی ہیں میں کتنا کم مذاق کرتا ہوں۔“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا پھر جیسے ان کی محبت سے پگھل گیا۔ عجیب بے بسی کا احساس اندر سے اسے جکڑنے لگا۔

”کیوں جلاتی ہیں آپ اپنا دل۔ دادی جان ضروری نہیں کہ ہر با اختیار نظر آنے

والا شخص اتنا ہی با اختیار بھی ہو۔ دل پر تو کسی کا اختیار نہیں چلتا ناں۔ آپ کو مجھ سے محبت ہے..... ہے نا۔ آپ مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتیں اس لئے ناں کہ آپ کے یہ اختیار

میں نہیں ہے۔ آپ چاہیں گی بھی تو مجھ سے نفرت نہیں کر سکیں گی۔“ اس نے لاڈ بھرے

لہجے میں کہا اور ان کے کندھے پر سر ٹکالیا۔

”کیا کوئی لڑکی تمہیں پسند ہے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے گھٹنے بالوں کو سہلایا۔ وہ چائے ختم کر کے ان کی گود میں سر ڈال کر تخت پر پھیل کر لیٹ گیا اور ان کی اس بات پر ہنسنے لگا۔

”مجھے پتا تھا میرے انکار پر یہی سوال اٹھائیں گی آپ۔ سوئیٹ دادی۔ اگر پسند ہوتی تو آپ کو بتانا چکا ہوتا۔ میری شادی سے انکار کا جواز ہرگز کوئی لڑکی نہیں۔ اور سنیچے یہ کسی صحیفے میں تھا نہ آسان سے اترے کہ پہلے بڑے بھائی کی ہی شادی ہو پھر چھوٹے کی۔ آپ اور ماما خوشی فہد کی شادی کر سکتی ہیں۔“ وہ ان کی تسبیح سے کھیلنے لگا۔

”ہاں..... ہاں“ تو پڑھ لکھ کر ہم سے زیادہ سمجھدار ہو گیا ہے۔ اب تو ہمیں سکھانے کا سمجھائے گا۔“ انہوں نے گھور کر دیکھا۔ ان کے چہرے کے زاویوں میں فنگلی سمٹ آئی۔ ”ٹھیک ہے یہ اصول اللہ کے بنائے ہوئے نہیں ہیں مگر ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس معاشرے کے کچھ اصول ہیں کچھ اچھے یا برے انسانوں کے بنائے ہوئے اور یہ کوئی اتنا برا اصول بھی نہیں ہے۔ اتنی خراب روایت بھی نہیں ہے کہ پہلے شادی بڑے کی ہو اور جب کوئی انکار کا سبب بھی نہ ہو۔ کیوں ضد لے کر بیٹھا ہے۔ میری بوزھی آنکھیں جانے کب بند ہو جائیں۔ تیری خوشی ہی دیکھنے کو تو زندہ ہوں اب تک۔“ ان کی لرزتی انگلیاں اس کے بالوں میں پھسلنے لگیں۔ وہ چپ سا ہو کر چھت کو گھورنے لگا۔

”اماں۔ اب آپ ہی سمجھائیے نا۔ تیور کو۔“ شمن دوپٹا دھاگے اور کروشیا اٹھائے اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ایک نظر غر پر ڈالی مگر اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی وہ شمن کی آواز سن کر بھی یونہی چت بڑا چھت کو گھورتا رہا۔ البتہ اماں شمن کی سمت ضرور متوجہ ہوئی تھیں۔

”کیا ہو گیا۔ کس بات پر سمجھاتا ہے؟“

”یونہی فہد کے معاملے میں تنگ دل ہو رہے ہیں۔“ وہ دوپٹا کھول کر کنارہ پکڑ کر اس پر دھاگا لپیٹنے لگیں۔

”دوسال کی تو بات ہے۔ یوں چنگی بجاتے گزر جائیں گے دوسال وہ پڑھ لے گا۔ کہتا ہے یہاں جاب اور آپ اچھی مل سکتی ہے۔ اختر بھائی بھی تو انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے تو کہہ بھی دیا ہے فہد کو سمجھ دیجئے۔ باقی وہ سب سنبھال لیں گے۔ اور پ تو جانتی ہیں اختر بھائی میرے سگے بھائیوں جیسے ہیں۔“

ان کی بات سن کر اماں جانے چائے گاگ ایک طرف رکھا پھر چشمہ آنکھوں سے ہٹا کر دوپٹے کے کتر سے صاف کرنے لگیں۔

”میں جانتی ہوں آپ بھی۔ اس معاملے میں چپ رہیں گی۔“ ان کی خاموشی پر شمن نے شکایتی لہجے میں کہا تو اماں نے جواباً انہیں دیکھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ فہد کا باپ ہے جو بھی سوچے گا اس کی بہتری کے لئے ہی ہوگا۔ اور پھر تیور کچھ غلط انکار بھی نہیں کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے ابھی اسے یہاں پر اچھی جاب مل رہی ہے ایک سال کر لے پھر خیر سے شادی کے بعد بیوی کو لے کر دوسال تو کیا تین سال بھی گزار آئے انگلینڈ میں۔“ انہوں نے تیور کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”اوہو اماں! تو کون سا فہد کے لئے ہمیں لڑکیاں تلاش کرنے میں جوتے گھسنے پڑیں گے خیر سے گھر کی لڑکی ہے۔“

”شمن۔ شمن۔ تم کسی قدر کم عقل عورت ہو۔

کیوں بیٹے کو نکاحوں سے دور بھیجتا جانتی ہو۔“ انہوں نے جیسے اٹھا چیا اور اسکی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔

”صرف اس کے بہتر مستقبل کے لئے۔“ ان کی انگلیاں تیزی سے دوپٹے کے کنارے پر اطمینان سے تیل بناتی جا رہی تھیں۔ ان کے لبوں پر ہند کے لئے پیار بھری مسکراہٹ تھی۔

”خمیک ہے تو وہ سال بھر بعد بھی جا سکتا ہے۔“

”مگر وہ نہیں مانتا۔“ انہوں نے اپنا حرکت کرتا ہاتھ روک کر بے بسی سے اماں کو دیکھا۔ ”آپ تو جانتی ہیں وہ کتنا ضدی اور دوسرے۔ ہمیشہ اپنی ہی منوا تا آیا ہے“ وہ لاچاری سے بولیں تو اماں اسے دیکھ کر گرہ گئیں، پھر ایک متا-سفا-نہ سانس بھر کر تنبیہ اٹھا کر اس کے دانے گھمائیں گئیں۔

”یہ سب تمہارے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے محض عمر کے مقابلے میں اسے زیادہ ناجائز اہمیت دینے کا انجام۔ مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ تمہاری عقل اب بھی پٹری سے اتری ہوئی ہے۔“ ماں سوچ کر گرہ گئیں بولی کچھ نہیں۔ ان کے اندر غم زدہ فضا میں سنسنے لگیں۔ وہ ہولے ہولے عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ جو یوں چپ لینا تھا گویا ان دونوں کے درمیان موجود ہی نہ ہو۔

وہ کیا سوچ رہا تھا، کن خیالوں میں گم تھا؟ انہیں علم نہ تھا مگر اتنا ضرور جانتی تھیں۔ کہ دشمن کی موجودگی میں اس کے اندر کھینچاؤ سا پیدا ہو جاتا تھا۔ چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی اور گہری خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی خوش نما آنکھوں کی تہوں میں برف سی کیفیت اتر آتی تھی۔ وہ یوں دکھائی دیتا جیسے برف کا آدمی ہو۔ مگر وہ جانتی تھیں اس برف کے اندر ایک آگ کا سلگتا آلاؤدہک رہا ہے۔ جو اسے اندر ہی اندر خاموش کر دے رہا ہے۔

”آ لینیے دو شہرہ کو۔ اب وہی اپنے بھائی کو سمجھائے گی اور اگر تیور کو نہیں سمجھا سکتی تو کم از کم اس باؤلے لڑکے کو ہی سمجھالے۔ میں تو عاجز آگئی دوںوں باپ بیٹے کی ضدی

طبیعت سے۔“ وہ جھنجھلاہٹ سے بولیں اور دو پٹا سیٹھنے لگیں۔ اس دم شہرہ کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا۔ تو اماں بھی چونک پڑیں۔

”ارے یہ تو شہرہ کی گاڑی کا ہارن ہے۔ بڑی عمر بے انہی ذکر کیا۔ ابھی آگئی۔“

جلدی سے دھاگے کروٹیا سیٹھ کر دوپٹے کے اندر ڈال کر دوپٹے کا گولا سا بنا کر ایک طرف رکھ دیا اور اٹھنے لگیں کہ شہرہ کتنی مسکراتی اندر داخل ہوئیں۔

”آداب امی جان۔“ گھر سے چکن کی شرت اور سفید چکن کی شلوار اور سفید دوپٹے میں وہ اس عمر میں بھی خاصی جاذب نظر دکھائی دے رہی تھیں۔

اماں بیٹی کی آمد پر خوش ہو گئی۔ انہیں احساس تک نہ ہوا کہ عرب شہرہ کو دیکھ کر تخت سے اتر کر باہر نکل گیا تھا۔

شہرہ نے سرسری نظر سے اس پر ڈالی تھیں۔ پھر اماں کے پاس بیٹھ کر اور ان کی خیریت دریافت کرنے لگی۔ جبکہ وہ لاؤنچ میں جانے کی غرض سے اس طرف آیا مگر درمیان نلتے پردے کے پار کھڑی عینید سے بری طرح ٹکرا گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے دھیانی میں بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اسکی بالکی چیخ پر اس نے شٹنا کر پردہ کھینچا تو وہ سر پکڑ کر کھڑی تھی۔

”غلطی تمہاری تھی۔“ اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ جلدی سے بولا۔ ”اس لئے

کہتا ہوں ہمیشہ دیکھ کر چلا کرو۔“ وہ ایک طرف ہو کر اسے جانے کا راستہ دیتا ہوا بولا۔

”میں جانتی ہوں ہمیشہ غلطی میری ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے معافی بھی مجھے ہی مانگنا پڑتی ہے۔ آپ تو غلطی پر فہم ہیں۔ یوں بھی آپ جیسے انا پرست معافیاں مانگنے کی غلطیاں نہیں کرتے۔ چاہے قصور کبھی نکل آئے۔“ وہ زمین پر گرا شولڈ بیک اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے مجڑے لہجے میں بولی تھی۔ ہزار شکوے سختی رہے تھے اس کے ایک جملے میں اور وہ کم فہم تو بہر حال نہیں تھا۔

اس کے چہرے پر پھلی خفگی کے سبب سے اچھی طرح واقف تھا۔
 ”غلطی کو تسلیم کرنے کی عادت اچھی ہے بلکہ خوبی ہے مگر تسلیم کر لینے کے بعد
 آئندہ محتاط رہنا چاہئے کہ آدمی سے غلطی دوبارہ نہ ہو۔“ وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر آگے
 بڑھ گیا۔

وہ یونہی اپنی جگہ جمی اس کے تصور پہنے پر سکتی رہی۔ اس شخص کے اندر شاید دل نام
 کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ کم از کم کل کے واقعہ پر زبان سے نہ سخی رویوں سے ہی سوری
 کر لیتا۔ وہ مزید یہاں چلنے کو مٹنے کے لئے کھڑی نہ رہی ابھر وہ بے نیازی کے ساتھ لاؤنج
 کے صوفے پر بیٹھ کر کوئی میگزین اٹھا کر اس کے ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ اور وہ دل ہی دل
 میں اسے کوئی ہوتی اماں جان کے کمرے میں چلی گئی جہاں مغل جم چکی تھی۔ فہم بھی آچکا
 تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا کر مسکرایا۔ وہ بھی مجھے دل کے ساتھ مسکرا کر اماں کے تخت پر چڑھ کر
 بیٹھ گئی۔



میں تیرے سنگ کیسے چلوں بچا
 تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا
 تو میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے چلے
 مہربانی تیری
 تیری آہٹ سے دل کا درپچہ کھلا
 میں دیوانی تیری
 میں دیوانی تیری
 تو غبار سفر میں خزاں کی صدا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا
 ریڈیو کی آواز نے یکدم اس کے ذہن کو منتشر کیا تھا۔ فائل سے نگاہ اٹھا کر اس
 نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ یہ آواز لان کے راستے سے ادھر آ رہی تھی۔ اور اسے سمجھنے میں
 قطعاً دیر نہ لگی کہ یہ حرکت سوائے اس سر پھری لڑکی کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جب
 سے آئی تھی سلسل اسے زچ کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اب اسے کمرے میں بھی
 سکون سے کام کرنے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنے آگے رکھی فائل بچ کر بند کی اور
 کھڑکی کی طرف آیا وہ سامنے کے چہرے پر انتہائی اطمینان سے ہنسی پاپ کارن کے
 ساتھ ایف ایم کے مزے بھی لوٹ رہی تھی۔

کھڑی کھلنے کی آواز پر وہ ذرا سا چہرہ موڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ پھر دوبارہ رخ
 موڑ کر شان بے نیازی سے پاپ کارن نکال نکال کر منہ میں ڈالے اور چباتے ہوئے ریڈیو
 کی آواز اور تیز کر دی۔

تو بہاروں کی خوشبو، گھٹی چھاؤں ہے
 میں ستارا تیرا
 زندگی کی ضمانت تیرا نام ہے
 تو سہارا میرا
 میں نے ساری خدائی میں تجھ کو چنا
 تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

اس نے غصے سے مٹھیاں سمجھ لیں۔ اسے سخت تاؤ آ رہا تھا اس کی ان بچکانہ
 حرکتوں پر۔

یہ شاید کل کے تھپڑ کا جوابی بدلہ تھا جو وہ لے رہی تھی۔ اس نے وہیں سے اسے

ڈانٹا جا پا، پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کا خیال تھا اس کے سلگنے پر وہ اور لطف اندوز ہوگی۔ اُس نے کھٹاک سے کھڑی بند کر دی اور پردہ گرادیا۔

تم چلو تو ستارے بھی چلنے لگے

آنسوؤں کی طرح

تم کو دیکھا تو آنکھوں میں چلنے لگے

آرزوؤں کی طرح

تیری منزل بنے میرا ہر راستہ

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

”قدیم، جنگلی، بیوقوف۔“ اس نے ساری فائلیں بند کیں انہیں دراز میں ڈالا اور

گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

خشن اور شرماں مہارانی کی خاطر مدارت کے لئے کچن میں مصروف جانے کیا

کچھ بنا رہی تھیں۔ پورا کچن بلکہ ڈائننگ روم تک خوشبوؤں کی لپیٹ میں تھا۔ شرماں جان

کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی دنیا جہاں کی باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ باہر نکل گیا۔

کچھ دیر سڑکوں کی خاک چھانتا رہا پھر ایک دوست کے یہاں چلا گیا اس سے

مکپ شپ لگانے کے بعد واپس آیا۔ اس کا خیال تھا شرماں بعد اس بلا کے جا چکی ہوں گی مگر

اسے سخت مایوسی ہوئی جب وہ سب کھا۔ نہ کی میز پر ہی موجود تھیں اس کا مطلب تھا کہ

’بد قسمتی سے ڈرنج بھی آج لیٹ ہوا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے عمر؟ آؤ کھانا کھا لو۔“ تیمور اسے دیکھ کر بولے۔

”میں کھا کر آیا ہوں پاپا۔“ اس نے زری سے جواب دیا بہر حال وہ خاصا فریٹ

ہو کر آیا تھا۔ ”ہاں اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔“

”کبھی ہمارے ساتھ بھی مل کر کھالیا کرو۔ دشمن تو نہیں ہیں ہم تمہارے۔“ خشن برا

سامنے بنا کر بولی۔

”صغریٰ بی بی عمر کو چائے بنا کر دے دو۔“ اماں جان نے صغریٰ کو آواز دیکرا سے

ہدایت دی۔ پھر خشن پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔

”روزی تو ہمارے درمیان بیٹھ کر کھاتا ہے۔ ہمارے ہی ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔

کبھی ہو جاتا ہے ایسا یا دوستوں میں مل کر کھالینا کوئی گناہ نہیں ہے۔“

وہ وہاں ٹھہرا ہی نہیں تھا کہ اپنے بارے میں کسی کے تہرے سنتا۔ شکوے شکایتیں

سنتا۔ ٹی وی لاؤنج میں جا کر صوفے میں گھس کر ریوٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔ ریسلنگ

آر بی تھی اور اسکی تمام تر توجہ اسکی طرف منتقل ہو گئی۔

”اہل دل حضرات“ ذرے ذرے میں دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں اور پتھر دل

انسانوں کو احساس کی دولت سے محروم ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔“ وہ اپنا گ اٹھائے

وہاں چلی آئی جس میں گرم گرم کافی تھی۔

عمر نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسکی طرف دیکھا تھا۔

”یہ بات کسی سیانے نے کہی ہے۔“ وہ اس کی اٹھتی نگاہ پر مسکرا کر بولی تو وہ

آنکھوں میں تجیر بھر کر بولا۔

”کون سی بات؟“ پتا نہیں اس نے واقعی اس کی بات نہیں سنی تھی یا انجان بن رہا

تھا۔ بہر حال ظاہر تو کچھ یونہی کیا تھا۔ وہ بری طرح سلگتی تھی۔ اسے اس کا یہ انداز قطعی ڈراما

بنی لگا تھا۔

”کچھ نہیں؟ آپ ریسلنگ ہی دیکھئے۔“ وہ کسی کم سن ناراض بچے کی طرح منہ پھلا

لڑخود بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جب اس نے گہری سانس بھر کر ریوٹ سے ٹی وی

انسوس ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے میز سے چائے کا گک اٹھالیا جو صغریٰ رکھ کر گئی تھی۔ اور پھر اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر زیرِ لب مسکرانے لگا۔

”واقعی مجھے انسوس ہے۔“ اور اس نے کچھ اور کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ شرہ یکدم ٹی وی لاؤنچ کے دروازے سے نمودار ہوئی تھیں۔ مگر وہیں رک کر عینہ کو گھورتے ہوئے بولیں۔

”تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو اٹھو اور جانے کی تیاری کرو۔ باتیں ہی ختم نہیں ہوتی ہیں تمہاری۔ دو گھڑی اماں جان کے پاس نہیں بیٹھ سکتیں۔“ ان کے لہجے میں اس قدر ترشی اور تکی تھی کہ عمر کو لگا جیسے وہ ساری کی ساری اس کے اندر اتر گئی ہوں، اور شاید وہ اتارنا بھی اس کے اندر چاہتی تھیں۔ وگرنہ وہ کب اپنی تازوں پٹی میں کو اس انداز سے مخاطب کرتی تھیں۔

”ممی! ابھی کچھ دیر تو بیٹھیں۔“ وہ جیسے جھل اٹھی۔

”فضول خد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اٹھو فوراً۔“ شرہ کا لہجہ مزید بے پلک ہو گیا۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتی بیٹھی رہی۔

شرہ کے تیور مزید بگڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ ماں بیٹی میں کھنچاؤ جاری رہتا عمر خود ہی لاؤنچ سے باہر آ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اسے آں کیا اور کرسی پر گر گیا، اور اسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کسی خیال کی احساس کی گرفت سے گلنا چاہ رہا ہو۔ ایک جھبن جو اس کے اندر رہتی تھی اس سے نجات چاہ رہا تھا۔



دلن بہت بے کیف سے گزر رہے تھے۔ اب پتا نہیں عینہ ہی کو لگ رہا تھا یا سب

آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اس معصوم بچے کی طرح لگ رہی تھی جو روٹھ کر رونا چاہے جو رد کر رہنا چاہے۔ اسے بے اختیار ہی اس پر رحم آ گیا۔

”کسی بہت ہی اچھے سیانے نے یہ بھی تو کہا ہے کہ جل کر کباب ہونے سے بہتر ہے آدمی کھل کر گلاب ہو جائے۔“ اس کا لہجہ دھما اور قدرے ملانم تھا اس نے مسکرتے سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے سامنے میز پر دھرے کر شل کے نفیس سے گلدان کو گھورتے ہوئے بولی۔

”میرادل چاہتا ہے کہ آپ کے سر پر یہ گلدان اٹھا کر دے ماروں۔“ اس نے یوں کہا جیسے واقعی یہ اس کی شدید ترین خواہش ہو۔

”ارے ارے، مگر کیوں بھی؟“ وہ لہجے اور آنکھوں میں حیرت سموتے ہوئے بولا۔ مگر اسے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر یوں کی تراش میں پھیلی مسکراہٹ کو سینھنے ہوئے بولا۔

”اچھا بھی۔ بہر حال۔ گلدان اٹھا کر مارنے کی اجازت تو تمہیں نہیں دے سکتا اس خواہش کو تو تم رہنے ہی دو۔“

”ہاں واقعی کیونکہ یہ گلدان بہت قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہونے کا مجھے بھی انسوس ہوگا۔“ اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا اور عمر کا بے ساختہ قبضہ بکھر گیا۔

وہ ایک دم اس طرح چونک کر تھی جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔

یہ قبضہ خاصا گونگوار تھا۔ گویا وہ خامے موڑ میں تھا اور وہ جل اٹھی یعنی کل کے واقعہ کا مصوف کو ملال تک نہیں۔

”میں اپنے کل کے رویے پر تادم بالکل نہیں ہوں۔“ وہ اس کے چہرے کو پھڑپھڑاتا تھا۔ اس نے کچھ جھینپ کر چہرے جھکا لیا تھا۔ ”بہر حال تم اگر ہرٹ ہوئی ہو تو مجھے دلی

محسوس کر رہے تھے۔ کئی دنوں سے اس نے "تیورولا" کی طرف چکر نہیں لگایا تھا۔ اس کا وہاں بھاگ بھاگ کر جانا ایک تو ثمرہ کو پسند نہیں تھا۔ دوسرے جس کے لئے جاتی تھی وہ اسے لائق توجہ نہیں سمجھتا تھا اس کی برنجی اکثر اس کا دل توڑ داتی۔

"امی یہ عمر بھائی مجھے اتنے اچھے کیوں لگتے ہیں۔" ایک روز وہ ثمرہ عمر کے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی تھی اور باتیں نانو کے گھر کی ہو رہی تھیں۔ تیورامون من ممانی، پھر اچانک وہ عمر کا ذکر لے آئی۔

ثمرہ آرن اسٹینڈ کے پاس کھڑی اپنی قمیص پر استری پھیرتے پھیرتے یکدم ٹھنکری گئی۔ اعصاب پر خفیف چھٹکا لگا تھا۔ پھر رخ پھیر کر اسکی طرف دیکھا مگر وہ بیڈ کے سائیز پر رکے لپ کے بہن کو کھول اور نگر رہی تھی۔ اسکا چہرہ جھکا ہوا تھا اور کئی لمبیں چہرے پر جمول رہی تھیں۔

"کزن ہے تمہارا" اس میں انہونی سی کون سی بات ہے۔" وہ سنہبل کر ناگواری چپا کر عام سے لہجہ میں بولیں۔

"کزن تو میرے فہد بھائی بھی ہیں۔ اور اپنی آپو (پھوپھو) کے وجاہت بھائی بھی ہیں۔ نعمان چچا کے نیل اور عقل بھی ہیں مگر جو بات عمر بھائی میں ہے وہ کسی میں نہیں یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا ہوگا۔ کہیں میں لوہے کا ٹکڑا اور وہ متقاضی تو نہیں ہیں کہ میں انہیں دیکھتے ہی۔"

"شٹ اپ عینی۔ کیا فضول بکواس کر رہی ہو۔"

وہ جیسے جھلس کر چلی تو اس نے گھبرا کر منہ میں انگلی دہالی۔ جیسے واقعی کوئی غلط بات منہ سے نکال دی ہو۔

"یہ سب تمہاری بچکانہ سوچ ہے۔ اس شخص میں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں

ہے۔ کوئی سٹارٹر کرنے والی خوبی نہیں ہے۔ عام سالک انتہائی عام سے شخص ہے۔" وہ چند لمبے وقف کے بعد بولیں تو لہجہ میں شعلے چمک رہے تھے۔

عینیدہ کے دل پر چوٹ سی گئی تھی۔

"امی، یہ تو زیادتی ہے ایسا تو نہ کہیں۔ اتنے پرکشش ہیں اس قدر شاندار اور چارمگ پرستلی ہے ان کی کہ۔"

"عینی۔" انہوں نے استری کا پلگ نکال کر اسٹینڈ پر پٹا اور بیگر کیا سوٹ اٹھا کر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اسے گھورا۔

"جاؤ مائی آگئی ہوں گی۔ اسے مشین کھول دو۔ ڈھیر سارے کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ کل بھی چھٹی کر لی تھی اس نے میں تم سے کہہ رہی ہوں عینی۔ اٹھو اور اس کے بعد اپنی بکس نکال کر پڑھنے بیٹھو۔ امتحان سر پر ہیں اور تمہیں فضول باتوں کی پڑی ہے۔ خبردار جو اماں جان کی طرف گئیں انگرام سے پہلے۔"

گوکہ انہوں نے دھمکی تو دے دی تھی مگر وہ جانتی تھیں وہ وہاں ضرور جائے گی۔ ایک تو کالج سے گھر یا کھل نزدیک تھا۔ اور دوسرے.....

اس سے آگے سوچ کر ان کا دماغ جھلنے لگا تھا۔ اس کے مردہ قدموں سے کمرے سے نکل جانے کے بعد وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کپٹیوں میں ایک کچھیا ڈسما محسوس ہونے لگا تھا۔

عینیدہ نے ان کے خدشوں کی کبھی راکھ کو کرید دیا تھا۔ ان کے واہموں کی دلی چنگاریوں کو ہوا دے ڈالی تھی وہ کم فہم یا کم سن تو نہیں تھیں کہ اس کے جذبول کو پہچان نہ پائیں اس کا بھاگ بھاگ کر تیور ولا جانا۔ سارا سارا دن عمر کے کمرے میں گھسے رہتا۔ اس کے گرد طواف کرتا۔ اس کی غیر موجودگی میں لان میں ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کرتا۔ پھر

اسے دن بھر کی روداد سنانا، آفرید بھی تو تھا اس گھر میں۔ بلکہ یہاں بھی آثار ہتاتھا مگر وہ تو اسے کبھی نظری نہیں آتا تھا۔

وہ جتنا سوچتی گئیں ان کے دماغ میں اتنے ہی خدشے اور خوف سراٹھا اٹھا کر انہیں اذیت دیتے رہے۔ تھک کر آنکھیں موند کر اس اذیت آمیز سوچ سے نجات پانے کی سعی کرنے لگیں۔



جلتی شمعیں ، روشن چہرے
کامنی لڑیاں ، نازک سہرے
زگرس بیلا ، موتیا ، لالہ
جوبی چمپا اور بنفشہ
ہر کوئی یارو شاد ہے نا
آج تمہاری سالگرہ ہے
دیکھو ہم کو یاد تو ہے ، نا

وہ خوبصورت سے کارڈ اور اس پر رکے ایک گلاب کے پھول کو دیکھ رہا تھا۔ جو عین یہ کالج جانے سے پہلے ادھر آ کر اس کے بیڈ کاز پر رکھ گئی تھی۔ وہ غالباً اس وقت آئی تھی جب وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کارڈ کے اندر لکھ لکھی تھی جو خاصی طویل تھی۔ اس نے پوری نہیں پڑھا۔

اس کے لیوں پر گردش کرتی مدھمی مسکراہٹ یہ سوچ اور پھیل گئی کہ وہ اٹھارہ انیس سالہ نازک، سوچوں کی مالک لڑکی دل کی واقعی اچھی تھی باوجود شرمہ کی بیٹی ہونے کے وہ اسے عزیز تھی۔ وہ ابھی کارڈ دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”نہیں، کم آن دروازہ کھلا ہے۔“ اس نے کارڈ اور پھول ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف پلٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر داخل ہونے والی شرمہ جیسے سفید کلف لگا دو پیاس پر جمائے وہ خاصی چھٹی نظروں سے اسے دیکھ کر اندر آ گئیں۔ پھر خود ہی بولیں۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”جی..... جی ضرور۔“ وہ لگنے والے اس خفیف سے جھٹکے سے جلد ہی سنبھل کر اخلاق سے بولا۔ پھر منتظر رہا کہ وہ خود ہی اپنے آنے کی وجہ بیان کریں۔ مگر جب وہ بولیں تو اس کے اعصاب کے پر نچے اڑا دیئے۔ اسے گویا شعلوں میں دھکیل دیا۔

”عمر میری بچی عینہ بہت چھوٹی اور معصوم ہے اسے اچھے برے کی تیز نہیں ہے ابھی۔ وہ ابھی لفظوں سے بہل جانے والی عمر میں ہے۔ اس عمر میں بھڑکنی آگ بھی چمکتی کوئی خوش نمائش دکھائی دیتی ہے جسے چھوٹے کی خواہش چل جاتی ہے۔ مگر وہ آپ کو چھوٹے کے بعد کی تباہ کاریوں سے بے خبر ہوتی ہے۔ جل جانے اور جھلس جانے کے احساس اور خوف سے بے نیاز ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائیں۔ بڑی استہزائیہ آمیز مسکراہٹ تھی مگر دوسرے بل لبوں کو چھپتے ہوئے بولیں بلکہ پھٹکاریں۔

”اور تم ایک جھک دار، پھوڑا انسان ہو اس کے ارد گرد یہ آگ دہکا کر اچھا نہیں کرے۔ ہو۔ تم سے اس کی یہ قوتی دلچسپی ہے۔ تم سے کوئی دائمی اور انٹ رشتے میں نہیں بدل سکو گے۔“

”آ۔ آپ۔“ وہ اس شدید قسم کے ذہنی دھچکے سے پوری طرح نہ نکل سکا اور کچھ لہنا چاہا کہ وہ جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے اسی لب و لہجہ میں بولیں۔

”مجھے تم سے صرف یہی کہنا ہے کہ تم اس سے دور رہو۔ اس کی اس معصوم عمر کو اپنے

فریب میں بکڑنے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں کامیابی نہیں ہوگی۔“ ان کی آنکھوں کی تہ میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور یہ ساری کی ساری وہ عمر کے وجود میں اتار کر کمرے سے نکل گئیں۔ جبکہ کمرے میں سلگتے احساس کے ساتھ کھڑے رہ جانے والے عمر کو لگا جیسے کمرے کی چھت اس پر آگری ہو۔ اور وہ پورا پورا اس کے ملے تلے توب کر رہ گیا ہو۔

اپنی پھولی کے اس قدر پستی میں اتر جانے کا تو تصور بھی نہیں تھا اس کے پاس۔

کتنی دیر تو وہ بے یقین رہا کہ کوئی اتنا گھٹیا الزام اس قدر رک جلد بھی اس کی ذات پر کر سکتا ہے۔

دوسرے پل اس کی رگوں میں خون کی جلد آتش سیال دوڑنے لگا۔ اسے اپنا پورا وجود کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ رگ رگ سے چنگاریاں پھوٹی محسوس ہوئیں۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اور ایک جھٹکے سے نیم اور دروازہ کھول دیا۔ مگر پھر کسی احساس نے اس کے قدم بکڑ لئے وہ دروازے کے فریم پر مضبوطی سے انگلیاں جما کر اپنے اندر سے اٹھنے والے غصے کے بال کو دبائے لگا۔

موجودہ حالات مبین روز و شب گزارتے ہوئے گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ آنے والے کسی لمحے میں اس کی ذات کو کوئی ایسی غلاظت بھری گالی سے گندا کر دے گا۔

اور، اور کس قدر رنج اور افسوس کی بات تھی کہ یہ سب شمرہ نے کیا تھا۔

کیا اس کا اپنا منہ ایسی گندی گالی دیتے ہوئے گندنا نہیں ہوا تھا؟

کیا ان کی بیٹی پر چھینے نہیں آئے تھے۔

ایسی ناقابل تلافی اذیت وہ دے گئی تھیں۔ اس کے ذہن میں تو ایسی دشمنی کہیں

بھی رقم نہیں تھی جو اس کی اپنی پھولی سے ہوئی ہو۔

اس نے کمرے کا دروازہ غصے سے لات سے بند کر دیا پھر شرٹ اتار لی اور سیدھا واش روم میں چلا گیا۔ کتنی دیر شاہد لیتے رہنے کے باوجود اندر کی آگ کم نہ ہوئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب حیرت غصے اور بے یقینی کی جگہ تاسف و دکھ اور رنج نے لے لی تھی۔

وہ آفس جانے کی بجائے سارا دن گاڑی لیے راستوں کی خاک چھانتا رہا۔ گھر آ کر رات بھر سگریٹ پھونکتے ہوئے اس واقعہ کی بد مزگی اور اذیت کو محسوس کرتا رہا۔ بہت کڑھئے، اذیت برداشت کر کے کے بعد وہ کوئی آدھی رات کو اپنی کھڑکی کی سلائیڈ کھولنے لگا ان کے اندر جیسے کو گھورتے ہوئے اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔

رگوں میں دوڑتی آگ کی پیش کش کم ہو گئی تھی۔ مگر دل میں اب نفرت آمیز جذبہ سر اٹھا رہا تھا۔

آپ نے اچھا نہیں کیا شمرہ پھوپھو۔ بہت برا کیا ہے۔“ اس کے لبوں کی تراش میں زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس ریک کے بے بنیاد الزام کی اذیت کا احساس کوئی پوشاک نہیں تھی جیسے وہ اتار دیتا۔ یہ تو اس کے جسم اور خون میں اتر گئی تھی۔ اس کے کھال سے لپٹ گئی تھی۔

اس نے خود کو کرسی پر گرالیا اور سگریٹ کے مرغلے میں نگاہیں گاڑتے ہوئے سوچتا رہا۔

”اگر آپ کی ناز و بی بی جی کی عرواقی فریب میں آجانے کی ہے تو میں اسے واقعی فریب میں بکڑوں گا اور کامیاب ہو کر دکھاؤں گا۔ میں اس کی وقتی دلچسپی کو دائمی محبت میں بدل دوں گا۔ آپ شاید ایک مرد کو رہنے کے باوجود مرد کی کئی پرتوں سے بے خبر ہیں۔ اب میں آپ کو یہ آگئی دوں گا کہ مرد وہی نہیں ہوتا جو دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ اور اب وہ آپ کو نظر آئے گا۔“ اس نے انگلی کو چھو جائیو الی را کھ کوا لیش

ٹرے میں جھاڑا پھر آدھی سے زیادہ سگریٹ بھی ایش ٹرے میں دبا کر مسل دی۔ مسلتے ہوئے خود بخود اس کی انگلیوں میں کرنگھی آ گئی تھی۔



وہ کالج گیسٹ سے نکل کر لڑکیوں کے جھوم کو چرتی کالج وین کی طرف بڑھنے لگی۔ کدایک کار کا زور دار ہارن اسکور کئے پر مجبور کر گیا جیسے کسی نے ہارن کے بل بوتے پر اسے متوجہ کرنا چاہا ہو۔ وہ رجسٹر کا ہتھ بٹائے بنائے پلٹی تو عمر کو دیکھ کر حیرت کا شکار ہو گئی۔ انہوں نے جو ہوئی تھی پھر حیرت سمیٹ کر فرنٹ ڈور کی طرف آئی اور شیشے میں سر ڈال کر اسے دیکھتے ہوئے حیرانگی ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

”آپ۔ یہاں۔ خیریت؟“

”آؤ بیٹھو۔ خیریت ہی ہے۔“ وہ آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر بولا۔ اس کے بیٹھے ہی ایمپشن میں لٹکی چابی کو جھٹکے سے گھما دیا۔ دوسرے بل گاڑی بتے پانی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی۔

کئی لمحے گاڑی کی فضا میں سکوت ہی رہا۔ وہ گاہے بگاہے اس پر حیرت آمیز نظر ڈال کر بے چینی سے اپنے بیک پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ اس کے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔ پھر اس کی طرف ذرا سا چہرہ موز کر بولا۔

”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب اتنا تو حق بتاتا ہوں کہ ہمارا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں کی ترش میں پھیلی مسکراہٹ کشادہ ہو گئی۔ گاڑی کچھ دیر بعد ایک ریستوران کے سامنے روک دی اور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

”تم نے میری برتھ ڈے کو یاد رکھا۔ مجھے ”وش“ کیا۔ کیا میں جواب میں اتنا بھی

وہ تو فوت ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ آیا یہ وہی عمریتور ہے یا کوئی اس کا ماسک چڑھا کر چلا آیا ہے کہاں وہ اکھڑا اور اسے خاطر میں نہ لانے والا کہاں یہ! اتنا مہذب، نازک احساسات کی پذیرائی کرنے والا۔

یا پھر یہ کوئی بے حد خوش نما خواب ہے۔

مگر یہ خواب بھی نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ اس کے ارد گرد بکھری ہوئی تھی وہ اس غیر متوقع صورتحال پر کسی طرح فوری رد عمل ظاہر کرنے کے قابل ہی نہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے عقل تو دیے بھی تمہارے پاس کم ہے اور بھوک میں تو رہی یہی بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہوگی۔ چلو آؤ۔“ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اور یکدم اسے بھی اپنے انتہائی کم عقل بے وقوف ہونے کا احساس ہوا تو سرعت سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

”میں کچھ چوسکتی ہوں کہ آپ میں یہ انقلاب کیسے آیا؟“ کئی لمحے کی خاموشی اور بے چینی کے بعد وہ آخر کار اپنی حیرت کے اظہار سے خود کو باز نہ رکھ سکی تھی۔

اس نے ویز کو اپنی پسند کے کھانے کا آرڈر دیکر مینو چارٹ بند کر کے اسے واپس پکڑاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟ کیا انقلاب؟“

وہ سر جھکا گئی۔ اور میز کے کنارے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”وش تو میں آپ کو پچھلے دو سالوں سے کر رہی ہوں آپ کی برتھ ڈے پر۔ مگر۔“

اس نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی انتہا کم سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لہجہ بھر اس

اس نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی انتہا کم سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر اس کے چہرے پر ایک مضطر بانہ بکا رنگ آ کر گزر رہا تھا۔ پھر کڑی سانس بھر کر کرسی کی پشت سے الگ کر اسے بے حد نرم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ذرا سانس دیا۔

”تمہیں یہ انقلاب پسند نہیں آیا؟“

اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ بس سراٹھا کر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ویر مستعدی سے لوازمات سجا کر چلا گیا۔

”عینہ! میرا خیال ہے محبت بلکہ بے غرض محبت ایک عجیب ہی ناک ہے۔ یہ

ہماری ساری دشتوں کو چوس لیتی ہے۔ ہماری روح کو ہلکا ہلکا پرست کر دیتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے روح میں اتر جانے والی نگاہوں سے اس کے معصوم خوش نما چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

چاول کے تجھے پر عینہ کی انگلیاں جانے کیوں کانپ سی گئیں۔ اس کی نگاہوں

میں ایسا کچھ تھا یا لہجے میں یا پھر جملے نے ہی اسے اندر باہر سے بے ترتیب کر ڈالا۔

میز پر چند لمحے سکوت طاری رہا۔ عمر اسی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے ذہن میں یکدم ہی خاص طوفان برپا ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں

میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ سر جھکا کر کتاب اٹھا کر اس پر ہلکی آواز سے مگر پورے دباؤ سے

کاٹنا مارنے لگا۔ پھر جیسے اندر باہر کے سکوت سے گھبرا کر بولا۔

”تم اتنی کم گو کب سے ہو گئی ہو عینہ۔“

وہ سراٹھا کر صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”کیا واقعی تمہارے لئے میری بات بڑا شاک یا بڑی حیرت ثابت ہوئی ہے۔“

وہ اب خود حیرت سے استفسار کرنے لگا پھر خود ہی سر جھٹک کر بولا۔ ”حالا کم میں اتنا روڈ۔“

اتنا ریزہ اور اس حد تک تم سے دور تو نہیں تھا۔ ہاں شاید۔ جس سے انسان بے حد قریب ہوتا ہے وہی فاصلے پر نظر آتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ پھر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

وہ تو بے درجہ حیرت کے جھکوں سے لنگ سی ہو کر رہ گئی تھی اسے تو اب یہ چاول

بھی منہ میں ڈال کر چپانا مشکل ہو رہا تھا۔ حقہ کے پانی جیسی سیال شے بھی اسے اپنے حلق

میں پھنستی سی محسوس ہوئی۔

چپائیں رستوران کے خوبیاں ماحول کا اثر تھا یا اس کی نگاہوں کا یا جملوں کا یا

پھر اپنے ہی دل کی وحشت کا وہ ایک دم ہی وحشی برنی کی طرح کھڑی ہو گئی۔

”ارے کیا ہوا؟“

”بس۔“ بھوک نہیں لگ رہی۔ یوں بھی میں نے کالج میں برگر کھا لیا تھا۔“

اسے اپنے جسم کے مساموں سے مینہ پھونٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے احساس تک

نہیں تھا کہ یہ وحشت اس کے چہرے پر سرخی بن کر عمر کو دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک دو لمحے

اس کی طرف دیکھتا رہا پھر۔ سر ہلا کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

”چلو جیسی تمہاری مرضی۔ مگر لڑکی اتنا بہت کچھ ضائع کر ڈالا۔ کم از کم مجھے ہی کچھ

کھانے دیتیں۔ میں نے قطعی کوئی برگر نہیں کھایا۔“

وہ شرمندہ ہو گئی۔ مگر اب اس شخص کے سامنے اسے بیٹھنا دو بھر لگ رہا تھا۔ وہ

ندامت کے باوجود وہاں نہ رکی اور تیز تیز قدم اٹھا کر گلاس ڈور کھول کر کھلی فضا میں نکل آئی۔

باہر آ کر اسے اپنے تپتے زخموں پر ہوا خنک خنک سی محسوس ہوئی۔ یوں جیسے

جلتے شعلوں پر شبنم کے چھینٹے پڑے ہوں۔

واپسی کا راستہ بے حد خاموشی سے طے ہوا۔ وہ اسے گھر کے سامنے اتار کر درش

انداز میں گاڑی بھگالے گیا تھا۔ اور وہ دروازے پر کھڑی ٹائروں کے احتجاج سے اڑنے والی دھول کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

”میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی میری زندگی میں ایسے قیمتی اتنے حسین لمحات بھی آئیں گے۔“ وہ گہری سانس بھر کر سرشاری کے عالم میں اندر چلی آئی۔



پورا دن اس نے ایک ممکنے احساس کے ساتھ گزرا مگر کایا اتفاقات اسے رہ کر حیرت۔ خوشگوار حیرت میں مبتلا کرتا رہا۔ اس کا دل چاہا وہ اپنی اس خوشی میں کسی کو شریک کرے۔ مگر کسے؟

اس کی تو کوئی بہن بھی نہیں تھی۔ یکدم خیال امین کی طرف گیا۔ اس نے جھٹ سے امین علوی کا فون ملا یا دوسری سمت وہی تھی۔ اس کی آوازن کرچکی۔

یا سماعت کا بھرم ہے یا کسی نغے کی گونج

ایک پہچانی ہوئی آواز آتی ہے مجھے

”ایمنی کی چی! کیا صبح وشام شاعری کا متیجن کھاتی ہے۔“ وہ چلائی تو وہ کھل کھلا

پڑی۔

”کہ کیسے یاد کر لیا کیا کام پڑ گیا مجھ غریب سے؟“

ویسے ابھی ہم دونوں کو کچھ بڑے زیادہ گھٹنے بھی نہیں گزرے۔ ہاں دیکھو جرنل ورنل مت مانگنا چونکہ ابھی تمہیں نہیں دینے کا بہت کام باقی ہے“

ہاں دیکھو جرنل ورنل مت مانگنا چونکہ بہت کام باقی ہے“

”کوئی مارو جرنل کو۔ آج تو میں تمہیں زندگی میں ملنے والی سب سے بڑی خوشی کی

بات بتانے والی ہوں بولو سنو گی؟“

”ایسی خوش خبریاں سننے کو تو کان ترس گئے ہیں۔ اب بھی پوچھ رہی ہوں سو گئی۔ بے وقوف لڑکی فوراً سنا دے۔“ اس کی بات پر وہ کہنے لگی۔ پھر کچھ لمحے توقف کے بعد ٹھہر ٹھہر کر سارا واقعہ گوش گزار کر دیا۔

”اوئے ہوئے۔“ امین نے اس کے چپ ہونے پر زور سے سیٹی بجائی کہ وہ خواہ مخواہ میں بلش ہو کر رہ گئی۔ یہ بھی اچھا تھا وہ بد نیز لڑکی سامنے نہیں تھی۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ

زندگی ڈوب گئی ان کی حسین آنکھوں میں

وہ میرے پیار بھرے افسانے کو انجام ملا

اس نے مارے شرم اور غصے کے ریسپورنٹ دیا۔ پھر بے اختیار کھل کھلا پڑی۔ اور ریسپور کو گھورنے لگی۔ اسے پکا یقین تھا وہ اس کا ترڈ اُبل کر رہی ہوگی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے پل تک پتہ نہ چلا۔ ریسپور اٹھاتے ہی وہ زور سے چلائی۔

”ایمن اگر۔ اگر اب تو انسانیت کے جامے میں نہیں آئی نا تو بس میں بات نہیں کروں گی۔“

”مسئلہ یہ ہے خاتون کہ انسانیت کے جامے ملنے کہاں ہیں ذرا پتا بتا دیں۔ میں خرید لوں گا۔“ دوسری طرف امین کی بجائے فہد کی آوازن کر اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

”اوہ۔ سوری میں سمجھی امین ہوگی۔ میری فرینڈ۔“

”یعنی اس کے حصے کی پھینکار میں نے کھالی۔ چلو اس کی بچت ہوگئی۔“ وہ ہنسنا تو وہ جھینپ گئی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اور کیسے ہیں آپ؟ نا تو کیسی ہیں اور؟“

”تمہاری دعا سے سب عافیت میں ہیں۔ بس خیر نہیں ہے تو میری نہیں ہے۔ اپنی

وے پھوپھو کہاں ہیں آج انہوں نے بخدا صراصر مجھے رات کے کھانے پر بلوایا ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ پائے بناؤں گی تم ضرور آنا۔“
وہ حیران رہ گئی۔

”اچھا۔ مگر میرے علم میں تو یہ بات نہیں ہے۔ صرف آپ کو ہی انویٹ کیا ہے۔ یا۔ کسی اور کو بھی۔“ وہ عمر کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔

”باقی کا تو مجھے علم نہیں ہے بس اپنی خبر ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ اور جانے کیوں اس کے اندر تیرا اثر گیا۔ اسے ہمیشہ امی سے یہی شکایت رہی تھی کہ وہ نانو کے گھر میں فہد کو ہی اہمیت دیتی تھیں۔ پر انہیں فہد سے انہیں اتنا لگتی رہی کہ وہ نانو کے گھر میں ان کا ہی جیٹھا تھا۔ ان کا خون تھا۔ ان کے جیتھے بھائی کی اولاد تھا۔

”یاری مٹی تم ماں بیٹی میرے لئے اتنا نہیں کر سکتیں کہ پاپا کو میرے باہر جانے کے لئے راضی کر لو۔ صرف دو سال کی تو بات ہے۔ یا کون سا میں عمر مجھرو ہیں چپک جانے کو کہہ رہا ہوں۔“ وہ اپنے مطلب پر آ گیا۔ عینید گہری سانس بھر کر مسکرائی گئی۔ ”سنا ہے بلکہ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ دیار غیر جانے والے چپک ہی جاتے ہیں۔ پر انہیں کون سا سلوٹن لگا کر جاتے ہیں۔“

”مگر میں بانی گاڈ کوئی سلوٹن لگا کر نہیں جاؤں گا۔ تاریخ کو ہرگز نہیں دہراؤں گا پلینز یاڈ ہیملپ کی مینی۔ ثمرہ پھوپھو اور بد قسمتی سے تمہاری بات پاپا مانا لیتے ہیں۔“ وہ التجا پر اتر آیا۔ وہ شیشا گئی۔

”سوری فہد بھائی اس معاملے میں وہ میری ماننا تو دور کی بات سننا بھی شاید گوارا نہیں کریں، اور پھر نانو بھی تو نہیں چاہتیں۔ آپ.....“ اس نے یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ ثمرہ کھڑی تھیں اور بنور اس کی گفتگو سن کر کونج میں تھیں کہ وہ کس سے

گفتگو ہے۔ وہ فوراً جان چھڑانے کو بولی۔

”چلیں، آپ ایسا کریں۔ ماما سے بات کریں ہو سکتا ہے وہ اس معاملے میں کوئی مدد کر سکیں۔“ اس نے کہا تو وہ بولا۔

”ہاں، دو پھوپھو کو ہی دو۔ تم سے تو کوئی امید رکھنا ہی بے کار ہے تم واڈی کا دوسرا روپ ہو۔“ وہ شاید جھنجھلا گیا تھا۔ وہ ہنس لگی اور ثمرہ کی طرف ریسور بڑھا دیا۔

لیجئے۔ آپ کے جیتھے جیتھے کافون ہے۔ بات کیجئے۔“ اس کے اس طرح کہنے پر ثمرہ نے آگے بڑھ کر ریسور اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ذرا گھور کر اسے دیکھا تھا اور پھر سارے جہاں کی مٹھاس لہجے میں بھر کر فہد سے باتیں کرنے لگیں۔ جبکہ عینید وہاں سے نکل کر لاؤنج میں چلی آئی اور صوفے میں جھس کر کٹرن گود میں دبا کر ایک دلفریب احساس میں گم ہو گئی۔

زندگی ڈوب گئی ان کی حسین آنکھوں میں

وہ میرے پیار بھرے افسانے کو انجام ملا

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا

دل یہ سمجھا کہ پھٹکتا ہوا اک جام ملا

ایمن کی شرارتیں یاد آنے لگیں اور ذہن پر خوب صورت یادوں کی برسات ہونے لگی۔



کئی دنوں بعد وہ تیمور والا آئی تو اماں اس سے اتنے دنوں کی غیر حاضری کی شکایت کرنے لگیں۔

کیا کروں نانو۔ امتحانات سر پر ہیں۔ سارا سارا دن کتابوں میں سر گھپاتے گزر

لگ رہا تھا سفید شیٹ پر ادھر ادھر رنگ بکھرے ہوئے اس نے سوچا پتا نہیں ان بکھرے رتوں میں کوئی واضح تصویر کس طرح جھلکے گی۔ انہیں کیسے تصویر کا روپ دیں گے۔

پھر سر جھٹکا۔

یہ خالص ان کا درد تھا۔ اسے کیا، وہ تصویر چھوڑ کر اس کی جیتی جاگتی شخصیت کو دیکھنے لگی۔ پھر دھیرے سے خود ہی بولی۔

”کیسے ہی آپ؟“

”بالکل ٹھیک، تم سناؤ۔ اسٹڈی ہو رہی ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے میں تاریخ سے تمہارا پہلا پیچر ہے۔“ اس کی اس معلومات پر وہ پہلے تو حیران ہوئی پھر دل خوشی سے بھر گئے۔ اس کے معاملے میں اتنی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کمرے میں چہرہ پر نگاہیں دوڑانے لگی۔

”پہلا پیچر کس بجلیٹ کا ہے؟“ وہ ہنوز تیزی سے برش سے رنگ پھیرتے ہوئے اسے ہم کلام بھی تھا۔

”اس کا کس۔“

”اچھا چلو ایڑی ہے۔“

”کہاں۔ آپ کے لئے ہوگا۔ اتنا مشکل لگتا ہے مجھے تو۔“ وہ منہ بنا کر بولی تو وہ اسے اسچو نکا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

”دنیا میں کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ اچھا ذرا یہ نیلی ٹیوب اٹھا کر دینا۔“ وہ اپنی تصویر پر تنقیدی نظریں ڈالے ہوئے بولا۔ وہ شاید اس میں کوئی فالٹ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے ذرا فاصلے پر رکھی میز سے نیلی لکڑی ٹیوب اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی اور اسے متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ لیجئے۔“

جاتا ہے۔“ وہ ان سے لپٹ کر صاف جھوٹ بول گئی اور اپنے جھوٹ پر اندر ہی اندر ہنس پڑی۔ (آپ کے پوتے کو پڑھ رہی ہوں نا تو سارا سارا دن اور ساری ساری رات) دل میں اس نے سوچا۔

”ہاں تمہارے تو ایگرام بھی اب ہونے والے ہیں۔ ایسے وقت تو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔“ شمن چائے کی فرامی لیے ادھر ہی آگئیں۔ ”فندے کے ایگرام ہوتے تو دروازہ اندر سے لاک کر کے رکھ لیتا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ میں کہوں لڑکے کم از کم دروازے کو لاک تو مت کیا کرو۔ میں کھانا تو رکھ جایا کروں تو پتا ہے کیا کہتا ہے۔ امی جان! اسی لئے تو لاک لگائے رکھتا ہوں۔ آپ بار بار ماما کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے ڈسٹرب کرنے چلی آتی ہیں۔ کبھی دودھ لینے کبھی جوس تو کبھی پنکٹ کبھی کچھ۔“ وہ چائے اس کے آگے رکھتے ہوئے بولیں تو وہ ہنس پڑی۔

”صغریٰ! ذرا یہ چائے عمر کو دے آؤ۔“ انہوں نے ایک کپ اماں جان کے آگے رکھا اور دوسرا اٹھا کر ملازمہ کو آواز دینے لگیں تو وہ جلدی سے بولیں۔

”لائیں، میں دے آتی ہوں۔ یوں مجھے بھی عمر بھائی سے کام بھی ہے۔“ اس نے جلدی سے شمن کے ہاتھ میں ٹھک تھام لیا اور کھڑی ہو گئی۔ شمن نے بس ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھا۔ بولیں کچھ نہیں پھر سر ہلا کر اپنا منگ بھرنے لگیں اور وہ ان کی اتنی نظروں سے بے نیاز سرعت سے لاؤنچ سے نکل کر عمر کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اپنے بیڈ روم سے ملحقہ کمرے میں اپنی ادھوری پینٹنگ پوری کرنے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر ذرا سا چہرہ موڑا تھا اور لحظہ بھر کر چلتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

”یہ آپ کی چائے۔“ اس نے مگ ریک پر ہی رکھ دیا اور خود بھی وہیں کھڑی ہو کر ایزل پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگی مگر کچھ پلے نہ پڑی۔ عجیب الجھی الجھی تصویر تھی۔ یوں

وہ پلٹا نہیں اور یونہی رخ موڑے موڑے ہاتھ بڑھا کر یوب لینی چاہی مگر بالکل اچانک یوب کی بجائے اس کا نرم ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔
پتا نہیں یہ دانستہ ہوا تھا یا نادانستہ۔

عینہ کے توپورے بدن میں سننا ہٹ سی دوڑ گئی۔
اس کے ہاتھ کے لمس نے اس کے اندر دھکی سی بھری۔
اسے اپنا پورا جسم دل کی طرح دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔

وہ شاید بے خبر تھا۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا پھر جیسے انتہائی مصروفیت کے عالم میں دھیان نہ دے سکا اور ہاتھ سے گرفت ہٹا کر وہ یوب تھا ملی اور اسے پلیٹ میں نکال کر گھولنے لگا۔

”مشکل کوئی سبب تک اس وقت لگتا ہے لڑکی۔ جب تیاری مکمل نہ ہو۔ وہ سر کے اوپر سے گزرا کر یوب کی طرف توجہ دو۔ ابھی سینڈائیر میں ہی اتنی مشکل پڑ رہی ہے تو تیری کام کیسے کر دگی؟“ وہ برش سے رنگ کس کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ جبکہ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ کر اس کے بیڈ کے کنارے جا کر بیٹھ گئی تھی اور دل کی حالت معمول پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔ اور بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

وہ اس پر آگ کے چھینٹے پھینک گیا تھا اور کیسا بے خبر تھا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور جلدی سے سر جھکا لیا۔ وہ رنگ اور برش نیل پر رکھ کر چائے کا گک اٹھا کر پلٹا تھا اور پھر قریبی اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اتنی چھوٹی سی اسٹول پر اتنا لمبا چوڑا شخص عجیب سا لگ رہا تھا۔

وہ اس پر نگاہیں ڈال کر پھر بلا وجہ اس کے بیڈ کے سائیز پر رکھے لائٹ کو اٹھا کر اسے کھولنے اور بند کرنے لگی۔

”میں کوئی بی کام نہیں کر رہی ہوں۔ لی اے کروں گی۔ مجھے اتنا کس سے بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے لائٹ رکھٹ کیا۔ ہلکا سا شعلہ اچھلا اور معدوم ہو گیا۔ پھر کھٹ کیا۔ شعلہ اچھلا مگر جلتا رہا اور وہ اس شعلے کو دیکھنے لگی۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے لائٹ چھیننا چاہا تو وہ فوراً متوجہ ہو گئی اور جھکے سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”آگ سے کیوں کھیل رہی ہو؟“ وہ قوف لڑکی، جل جاؤ گی۔“ وہ خالی ہاتھ نیچے کرتا ہوا اسے بغور دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

وہ پلٹیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر لائٹ دوبارہ آگے کرتے ہوئے بولی۔
”اچھا لگتا ہے آگ سے کھیلنا۔ میں چلنے سے نہیں ڈرتی۔“ اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر نرمی سے لائٹ لیتے ہوئے بولا۔

”اچھی بات ہے ڈرنا بھی نہیں چاہئے۔ میں جو ہوں نا تمہارے قریب۔ تمہیں چلنے نہیں دوں گا۔“

”عینہ کے دل پر جیسے ایک بار پھر آگ کے چھینٹے پڑے تھے۔ بے ساختہ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تھا مگر وہ سر جھکائے دراز سے سگریٹ کا پینک تلاش کر رہا تھا اور وہ ایک بار پھر دل کو اپنی رگوں میں خون کی طرح دوڑنا ہوا محسوس کرنے لگی۔

اس کے ذمعی جملوں نے اس کے بدن کو جیسے شل سا کر کے رکھ دیا تھا۔
وہ پلٹا تو اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جسے وہ لائٹ کا شعلہ دکھا رہا تھا۔
”اور اب جو آپ اپنے اندر آگ اتار رہے ہیں۔ چلنے کا ڈر نہیں۔ یہ تو خاکستر کر

دینے والی شے ہے۔“ وہ جانے کیسے جواباً ذمعی بات کہہ گئی۔ ایک دوپل وہ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھواں بوسے باہر نکال کر دھیمے سے مسکرایا۔

”نہیں، تم جو پاس ہو کیا جلنے دو گی مجھے؟“ وہ اچانک اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا تھا۔ اس نے شپٹا کر پلکوں کی باڑھ کے ساتھ چہرہ بھی جھکا لیا۔ اسے اپنے ہر سام سے پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہونے لگا رخصار پتہ ہوئے محسوس ہونے لگے جیسے ان پر کسی نے دھکنا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ اس صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر تیزی سی اپنی جگہ سے اٹھی۔

ارے وہ میں اپنی جائے تو نانو کے پاس ہی بھول آئی ہوں۔“ عجیب بے نیلے پن سے وہ بہانہ بناتی دروازے کی جانب بھاگ لی۔
عمر نے بند دروازے کو دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا رہا پھر گہری سانس بھر کر بیڈ پر بیٹھ کر اس کی اونچی پشت سے ٹیک لگالی۔

اسے یکدم اپنی کپٹیوں پر دباؤ محسوس ہونے لگا۔
شدید ترین احساس ندامت اور بے بسی کا غلبہ ہوا تو جڑے بھیج گئے۔ وہ بڑے بڑے کس لگا تا ہوا دھواں کچھ اندر اور کچھ باہر پھیلتا گیا۔

عینہ کا معصوم، پاکیزہ شفاف حسن اس کی نگاہوں تلے لہرانے لگا۔
ایک بل وہ خود کو دنیا کا انتہائی غلیظ شخص محسوس کرنے لگا۔ خود سے کراہیت آنے لگی۔

مگر دوسرے بل اپنی ذات پر لگائے گئے الزامات کے انگاروں کی تپش چھلانے لگی جو پتھر ٹھرہ نے مارے تھے اس کی اذیت ایک بار پھر شدت سے محسوس ہونے لگی۔
وہ کراہیت اور ندامت کے احساس سے نکل کر، پھر بے بسی کی ڈھال میں چھپ گیا۔

وہ ماضی کو فراموش کر سکتا تھا مگر اب حال کے اس واقعہ کو نہیں جس نے اس کی رگ

رگ کو نفرت آمیز انتقام سے بھر دیا تھا۔

میں پانچ دس سالہ عمر تیر نہیں ہوں ٹھرہ پھوپھو جو تین لیل کے احساس کو گھول کر پی جانے پر مجبور تھا۔

میرے لاشعور میں بس اہانت کے اس سارے احساس کو بھی دفعتاً جگا دیا ہے
آپ نے اور میں اب جو میرے اندر اتارا گیا ہے آپ کی طرف سے۔
اس نے انگلیوں تک آ جانے والی سگریٹ کی سلگتی راکھ کو دیکھا اور آہستگی سے اسے جھٹکنا چاہتا تھا۔



”میں کیا کروں ایمنی۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کتاب کھولتی ہوں تو بس وہی چہرہ نظر آتا رہتا ہے۔ کتاب میں لکھے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔ اور اسکی آواز۔ اس کی باتیں ذہن میں گونجنے لگتی ہیں۔“

”ایمن زور سے نفس پڑی۔ پھر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

”چلو ٹھیک ہے یعنی..... مگر سوچو۔ اس طرح تو تمہاری پڑھائی سخت متاثر ہو رہی ہے۔ دیکھو محبت اپنی جگہ پڑھائی اپنی جگہ تمہیں اپنا فیوچر بنانا ہے۔ محبت کو راہ کی رکاوٹ مت بناؤ اسے محض دل کے اندر رکھو۔ خدا کے لئے اب رونے مت بیٹھ جانا۔ کتاب کھولو تو خود دل لگے گا“ وہ اسکی آنکھوں میں یکدم اندے والی نمی کو دیکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی تو وہ لب بھیج کر رہ گئی۔ پھر گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے بڑی بے دلی سے کتاب کھول کر مطلوبہ چپٹر ڈھونڈنے لگی۔ ایمن نے نے مجلس کروہ چپٹر کھول کر جھٹکے سے اس کے سامنے کر دیا اور تنہائی آئینہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ اس نے کھیا کر جلدی سے کتاب پر ہتھ ہیں جھکا دیں پھر کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ ایمن بھی اپنا جزل کھول کر پڑھنے لگی۔

”ایمن!“ کئی لمبے توقف کے بعد وہ بولی تو ایمن چونکی مگر سر جھکائے جھکائے ہی ”ہوں“ کہا پھر اس کی خاموشی پر اسراٹھا کر بولی۔

”کیا ہوا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کیا۔“ اس کا اشارہ کتاب کی طرف تھا وہ سر ہلانے لگی۔

”ہاں۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا۔ تم سمجھاؤ نا۔“

”چلو پوچھو۔ کیا سمجھ نہیں آ رہا؟“ وہ بال بین جنرل پر رکھ کر اسے اور پھر کتاب کو

دیکھنے لگی۔ تب وہ دھیرے سے مجرمانہ انداز میں بولی۔

وہ کتنے دنوں تک ”تیرورولا“ نہ جا سکی۔ اٹھتے بیٹھتے کبھی اسے اپنے ہاتھ راس کا وہ لمس محسوس ہوتا، کبھی اس کے جیسے سامعین سے ٹکرانے لگتے اور دل پہلو میں جھل جھل جاتا۔ بار بار وہ منظر یاد کرتی۔ وہ جیسے ذہن کی سطح پر لاتی، اور کتنی دیر تک دل کی دھڑکنوں کے شور کو سنتی رہتی۔ دھیرے دھیرے مسکراتی رہتی۔

اس روز ایمن کے ساتھ اسٹڈی کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان کتاب کی بجائے عمر کی طرف تھا ایمن نے اسے جھڑکا۔

”خدا کے لئے سنی۔ پڑھائی پر توجہ دو۔ کل پیپر ہے اور تم ہو کہ فضول سوچوں میں کھوئی ہوئی ہو۔“

”جواباً اس نے ایمن کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا اور لب بھیج کر کتاب زور سے بند کر دی۔

”میں اس شخص کو شدت سے چاہتی ہوں ابھی۔ مگر کچھ میں نہیں آتا کہ وہ شخص کیا چاہتا ہے۔ کیا وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے اور اتنی شدت سے۔“

ایمن نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی چیز ہاتھ لگے جسے اٹھا کر وہ اس لڑکی کے سر پر کھینچ مارے۔

وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بے ساختہ ہنسی کو نہ روک پاتی تھی۔

”بس..... نہیں پڑھا جاتا مجھ سے۔ دے دوں گی۔ پیچھے پیچھے۔“

اس نے کتاب زور سے بند کی اور دو دھکیل دی پھر دونوں پیر سکڑ کر گھٹنوں پر

تھوڑی نکالی۔

”میرا دل چاہتا ہے تمہارے دل کو اور عمر تیرو کو گولی مار دوں۔ جانے کہاں سے ٹپک پڑا یہ شخص۔ اور مروت محبت کی آگ میں۔ میں چلتی ہوں۔“ ایمن اپنی کتابیں اسائنمنٹس سیننے لگیں تو وہ گھبرا گئیں۔

”کک..... کیا مطلب..... تم جاری ہو۔ ایسی پلیز ایسے تو مت کرو۔“ اس

نے منت سے آمیز انداز میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”تو کیا کروں۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر لمبی لمبی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھروں۔ غم زدہ آہیں بھروں اور سنوں۔ بھاؤ ہاتھ سدھرنا ہے تو سدھر جاؤ۔ کم از کم اگزام کے دنوں میں تو دل و دماغ پر کنٹرول رکھو۔“

ایمن کی اس جھڑنے واقعی اثر کیا وہ سنجیدگی کے ساتھ کتاب کھول کر رٹا لگانے لگی۔



آخری پرچہ دے کر آئی تو اسے لگا جیسے اس کی روح کسی بوجھ سے آزاد ہو کر ہلکی

پھلکی ہو گئی ہو۔ وہ کتابیں ایک طرف ڈال کر نہا دھو کر سیدھی ”تیمور ولا“ پہنچی تو وہاں خاصی چہل پہل نظر آئی۔ شمن کی بہن اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ آئی ہوئیں تھیں۔ لاؤنچ میں خاصی رونق تھی۔ فہد قالمین پر بیٹھا کاشن گود میں دبائے کوئی لطیفہ سنار ہاتھ جس پر خود بھی ہنس رہا تھا اور سب کو ہنسا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا وہ شمن کو سلام کر کے اس طرف ہی آ گئی۔

”آؤ کرن۔ ابھی تمہارا بی ذکر ہو رہا تھا۔“

”میرا ذکر..... مگر ابھی تو تم لطیفہ سنار ہے تھے۔“ وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

”تو تمہارا ذکر ہوا نا۔“ وہ برجستہ بولا تو حما اور مونا ہنسنے لگیں۔ جب کہ اس نے

صوفے سے کٹھن اٹھا کر اسے جڑ دیا۔

”تم ہو کے لطیفہ بلکہ لطائف۔ نا تو کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر نظریں

دوڑائیں اور اٹھنے لگی کہ فہد نے اسکی کلائی پکڑ لی۔

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں

ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ ”مجھے پتا ہے دادو کا تو بہانہ ہے تم ابھی عمر کے

کمرے میں دوڑ لگاؤ گی۔“

وہ کلائی چھڑاتے ہوئے دھک سے رہ گئی۔ پہلو میں دل بے ترتیب سا ہوا۔

پچھلے جھپک کر اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ تو کیا اس کی بے تائیاں سب کو دکھائی

دینے لگی ہیں؟

”میں نا تو کے پاس ہی جاری ہوں۔ سمجھ تم۔“ اس نے بروقت خود کو سنبھالتے

ہوئے کہا اور پلٹ کر لاؤنچ سے باہر نکل گئی۔

فہد نے سچ ہی تو کہا تھا نا تو بہانہ تھا اس کے قدم چٹا بانہ انداز میں راہداری کے آخری والے کمرے کی طرف اٹھنے لگے اور ہر اٹھنے قدم کے ساتھ دل یوں دھڑکتا گیا جیسے ابھی پہلو سے نکل جائے گا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہلکے سے دباؤ سے ہی پورا کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی مگر کمرہ خالی تھا۔ اس نے درمیانی پردہ ہٹا کر دیکھا یہ حصہ بھی خالی تھا۔ البتہ واش روم کی بتی جل رہی تھی اس کا مطلب تھا وہ اندر ہی تھا۔ وہ سینیں بیٹھ کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔ اور یونی رانٹنگ نیل پر آکر ترتیب سے سچی ڈائریوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایک ڈائری کھلی ہوئی الٹی رکھی تھی یوں جیسے کوئی لکھتے لکھتے پاؤں سے پڑھتے ابھی اٹھ کر گیا ہو۔ وہ رانٹنگ نیل کی ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور ڈائری کھول کر اس کے ورق گردانی کرنے لگی۔

خوب صورت پنڈر رانٹنگ میں کچھ آفس کا ورک تھا۔ کہیں کہیں حساب کتاب اور درمیان کے چند صفات پر شاعری رقم تھی۔

اس کے لمبوں کی تراش میں بے ساختہ ہی تحیر آمیز مسکراہٹ چمکی تھی۔ وہ پڑھنے لگی۔

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے

عہد و بیباں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا

اور سکوں ایسا کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

اس نے صفحہ پلٹا ایک اور نظم لکھی ہوئی تھی۔ وہ پڑھنے لگی کہ کسی نے پیچھے سے

اس کے ہاتھ سے نزی سے ڈائری لی۔

”بہت بری بات ہے ایسی چیزیں بغیر اجازت نہیں اٹھائی اور پڑھی جاتیں۔“

وہ شرمندہ سی ہو کر جلدی سے کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ نہا کر نکلا تھا کندھے پر گیلا

تولیہ پڑا تھا بالوں میں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

”بس یونی نظر پڑی تو پڑھنے بیٹھ گئی۔ وہ جھینپ کر وضاحت کرنے لگی۔

”ہر چیز پڑھنے کی نہیں ہوتی۔“ اس کی بھاری دھیمی آواز بے حد قریب سے

گوئی۔ پھر وہ اسی دھیمے لہجے میں بولا۔ ”دیے کچھ سمجھ میں آیا۔“

”نہیں..... اس قدر مشکل شاعری تھی اور اتنی اداس۔“ وہ سادگی اور صاف گوئی

سے نرفی میں ہلاتے ہوئے دور بیتی پھر کرسی کے ہتھکڑے پر ہاتھ جماتے ہوئے اس کے

ہاتھ میں موجود ڈائری کو دیکھ کر بولی۔ ”اس قدر اداس اور کبھی کبھی شاعری کیوں کرتے

ہیں۔ آپ؟“

اس کی بات پر وہ زیر لب مسکرانے لگا اور ڈائری نیل پر رکھ کر دوسری اٹھالی۔

”یہ میری نہیں فیض کی شاعری ہے جو میں کرتا نہیں پڑھتا ہوں۔ میں تو آج کل

اس طرح کی شاعری پڑھنے اور لکھنے لگا ہوں۔“ اس نے سیاہ جلد والی ڈائری کھولی اور اسے

تھمادی پھر پلٹ کر ڈیرنگ نیل کے سامنے جا کر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔

اس نے ایک نظر اس کی پشت پر ڈالی پھر ہاتھوں میں تھما لی گئی اس ڈائری پر جس

کے سفید براق صفحے پر اس کی پنڈر رائٹنگ کسی موتیوں کی طرح بکھری دکھائی دے رہی تھی۔

میر زندگی میں بس اک کتاب ہے

اک چراغ ہے

اک خواب ہے اور تم ہو

یہ کتاب و خواب کے درمیاں جو منزل ہیں

میں چاہتا تھا

تمہارے ساتھ بسر کروں

یہی کل اٹھائے زندگی ہے

اس کو زانو سفر کروں

میرے دل جاوہ خوش پہ بجز تمہارے

کبھی کسی کا گزرنہ ہو

مگر اس طرح کہ تمہیں بھی خبر نہ ہو۔

دوسرے صفحے پر بھی ایک چھوٹی سی نظم تحریر تھی مگر اس سے مزید پڑھائی نہ گئی۔ تنہا ہوتی تو شاید ضرور پڑھتی بلکہ بار بار پڑھتی۔ مگر اس وقت اسے اپنے اعصاب پر ہلکا سا ارتعاش طاری ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے عمر اسے یہ نظم خود پڑھ کر سنار ہا ہو۔

ڈائری اس نے جلدی سے رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

وہ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے گداز ہونٹوں میں دھیمی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس نے اسے پلکیں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

کیا خیال ہے؟ یہ تو اداس اور تنہی، بھیجی شاعری نہیں تھی۔ ”وہ بیروں میں سادی چیل ڈالتے ہوئے بولا اور پلیٹ کروارڈ روپ کھولتے ہوئے اچانک یاد آنے پر بولا۔

”ارے ہاں۔ تمہارا ہتھ ڈے گفت تو یونہی میری الماری میں ہی رکھا رہ گیا ہے۔“ وہ جلدی جلدی الماری میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

وہ چونکی، پھر مسکرا دی۔

”میری ہتھ ڈے کو گزرے دو ماہ ہو چکے ہیں۔“

”اب کیا کیا جائے کہ کیا تو دو ماہ پہلے ہی تھا مگر خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ پلٹا تو اس

کے ہاتھ میں ایک گفٹ بیگ تھا جو اس نے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”دیسے تو تھوہ وہی اچھا جو بروقت ملے اور خاص کر پیار بھرا تھوہ تو بروقت ہی ملتا

چاہئے۔ جذبول کا تریمان بن جاتا ہے۔ اپنی دے۔ آئی ایم سوری فورڈیٹ۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک گہری معذرت خواہانہ سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ دھڑکتے دل

کے ہمراہ آگے بڑھی اور وہ گفٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا جو بے حد نفیس ریپر میں عمدہ

طریقے سے پیک کیا ہوا تھا اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔

ایک بے حد قیمتی لڑکی کیلئے۔

اس جملے نے اس کے خون میں نشہ سادوڑا دیا۔ وہ شوریدہ سر لہروں کے طوفان

میں جیسے بہہ گی۔

عمر تیرو راہنے عام سے سراپے مگر مقناطیسی شخصیت کے ساتھ اس کی روح تک میں

اتر گیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ جملہ قیمتی تھا۔

”تھینک یو عمر بھائی..... بھائی اس کے لئے اس کی آواز لڑکھرائی۔

”اٹس آل رائٹ۔“ وہ ہم سے انداز میں مسکرا دیا۔

پھر وہ خاصی دیر اس کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ عام سی گفتگو

میں کبھی کبھی عمر کے ذوقی جملے اسے لمحہ بھر کے لئے شینا دینے پر مجبور کر دیتے۔ کبھی اسے مہر

بالب کر ڈالتے.... مگر پھر دوسرے پل وہ نیا موضوع یوں لے آتا کہ اس کا تاثر دھیمہ پڑ

جاتا اور ایسے میں وہ شکر ادا کرتی۔

ہاں مگر تنہائی میں اس کی باتیں، اس کی مسکراہٹیں اس کے دل میں طوفان بپا کر

دیتیں اسے لگتا وہ عمر کی محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے۔ اس کی شخصیت کا سرخ حوض کا مقید

پانی نہیں تھا بلکہ ایک رواں سمندر تھا جو اسے ٹھہرنے نہیں دے رہا تھا اور وہ سینکے کی طرح جیتی

چلی جا رہی تھی اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت کے بحر میں گرفتار ہر شے سے بے خبر ہوتی جا رہی ہے۔

دھچکا تو اسے اس روز لگا بلکہ کبھی کو جب اس کا انٹرمیڈیٹ کا رزلٹ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”آئی ڈونٹ بیلو اٹ مینی۔ یہ..... یہ تمہارا رزلٹ ہے؟“ شرہ حیرت زدہ تھی۔ وہ دوپروں میں رہ گئی تھی باقی کے نمبرز بھی سوسو تھے۔

وہ مارے شرمندگی کے زین میں گزر کر رہ گئی۔

عینہ بہترین نمبرز میں کامیاب ہونے والی عینہ سے کسی کو بھی ایسے ٹھٹھارے کا توقع نہ تھی۔ خود تیمور دلا میں بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ چونکہ وہ اتفاق سے اس وقت آیا تھا جب شرہ اسے خوب لتاڑ رہی تھیں۔ اور وہ صوفے میں دبی ٹیکسی صرف آنسو بہا رہی تھی۔

اسی بات سے روتی تھی میں۔ تمہارا روز روز تیمور دلا جانا یہی دن دکھا سکتا تھا۔“

شرہ نے کہا تو یہ چاہا تھا کہ ”تمہارا عمر کے کمرے میں بھاگ بھاگ کر جانا یہی دن دکھا سکتا تھا مگر جانے کسی مصیبت کے تحت وہ صرف ”تیمور دلا“ کا کہہ کر رہ گئیں۔ البتہ انہیں اپنے خدشات کی آہٹ بے حد نزدیک محسوس ہونے لگی تھی۔

تیمور دلا میں بھی سب کو شک ابھ گیا تھا۔ خود بھی چند ٹائپ اس خبر پر دنگ رہ گیا تھا۔ ذہن خالی خالی ہو کر رہ گیا کہ وہ اس خبر کو کس انداز میں لے اتنی ذہن عینہ کا ایسا رزلٹ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مگر نہیں اس کے اندر ایک صدا ابھی۔ جھوٹ بولتے ہوئے تمہارے لئے کم از کم یہ دھچکا نہیں ہے۔

اسے لگا جیسے کوئی اسے اندر سے جھنجھوڑ کر اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ شرمسار سا ہو کر

لاؤنچ سے اٹھ گیا۔ وہ اماں جان کے پاس بیٹھی تھی۔ کبھی فردا فردا اس کے رزلٹ پر حیرت کا اظہار کر چکے تھے۔ ایک وہی جب تھا۔ اس کے پاس نہ حیرانگی ظاہر کرنے آیا تھا نہ تعزیت۔ ڈنر کے بعد وہ خود ہی جانے سے پہلے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اسے دیکھ کر دراز کھول کر خود کو مصروف ظاہر کرنے لگا اور اس میں سے فائلیں نکال نکال کر بیڈ پر رکھنے لگا۔

روٹی روٹی آنکھیں اور متورم غم زدہ چہرے کے ساتھ وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی پھر خود استہزائیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔

”میں تو خطر ہی رہی کہ آپ بھی آئیں گے اپنی حیرت ظاہر کرنے یا پھر دلا سے دینے یا مجھے شرمندہ کرنے۔ آپ کیوں نہیں آئے یہ فرض ادا کرنے؟“ وہ اندر چلی آئی۔

”کیا اب اس کی کنجاش رہ گئی تھی؟“ وہ نظریں بچاتا ہوا بولا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے جانے کیوں گریز کر رہا تھا جب کہ وہ ابھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یک دم وہ پر اعتماد اور خاص پیچورڈی نظر آنے لگی تھی شاید گہرے دکھ اور رنجیدگی کے باعث ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ بھی یہ فرض پورا کر لیتے تو اچھا ہی تھا۔“ وہ دھیرے سے بولی اور کارز نیبل پر بے شویش کو گھورنے لگی۔

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے ہاں اگر اچھا رزلٹ آتا تو مجھے بے حد خوشی ہوتی بہر حال تم خود ہی یہ حق دے رہی ہو تو پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہو گیا؟“

وہ اس کے ہنسنے کو دیکھ رہا تھا تب ہی اچانک اس کی سسکیاں اٹھنے لگیں پھر سسکیاں تیز تر ہونے لگیں۔ وہ سہلچا کر رہ گیا۔ وہ چلتی تھی اور رواں آنسوؤں کے ساتھ بولی

بلکہ جینی۔

”میں نے“ میں نے بھی خود کپ چاہا تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے۔ اس طرح ہو جائے۔ اپنے آپ سے میرا اعتماد اٹھ جائے۔ میں تنکے کی طرح اپنی سوچوں اور خیالات کے سیلاب میں بہہ جاؤں۔ یقین کریں اس طرح تو میں نے بھی نہیں چاہا تھا۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بلکنے لگی یہ چوچین خاصہ پریشان کن تھی۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی اس کی طرف سے اس طرح کے ہچکا نہ رویے کی۔ اسے فوری طور پر تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا رد عمل اختیار کرنا چاہئے۔ پھر کچھ سوچ کر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے قریبی صوفے پر بیٹھا دیا۔ وہ ہنوز دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے روئے جاری تھی۔ اس نے نرمی سے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹا دیے۔

”تمہارے اس طرح رونے سے میں صرف الجھ سکتا ہوں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا اور قدرے پرسکون تھا۔“ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ صرف اور صرف بڑھاپے کا توجہ دو۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم اپنا تمام تر دھیان اور توجہ اپنے ایگزام کی طرف رکھو۔“

”جھوٹ بولتے ہیں آپ۔“ وہ یکدم بھٹک کر کندھے پر دھرا ہوا اس کا ہاتھ جھٹک کھڑی ہو گئی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ رخ پھیر کر کرب کے شدید ترین احساس کیساتھ لب دانتوں میں بے دردی سے کاٹنے لگی۔ ہاں بھلا وہ کس دلیل سے اس کی بات کو رد کر سکتی تھی۔ وہ کیوں کر اسے جھوٹ ثابت کر سکتی تھی۔

اس نے جو آج تک محسوس کیا تھا اس کی بنیادی کیا تھی۔ کس بل بوتے پر وہ اسے مجرم ثابت کرتی۔ وہ تو ایسا شکاری تھا جو بنا جا بل ہی شکار کر ڈالتا ہے۔

اس کے ہاتھ خالی تھے کسی بھی الزام سے۔ وہ کس طرح اسے مجرم کے کٹہرے

میں کھڑا رکھ کر کوئی الزام اس کے سر تھوپ سکتی تھی۔

وہ خود ہی پاگل تھی جو بوند وار اپنے دل کے ہاتھوں دوڑتے دوڑتے اس گلی میں آچکی تھی جہاں واپس پلٹنے کا کوئی راستہ بھائی نہ دے رہا تھا اور آگے..... آگے منزل کا موم سم نشان بھی جسے گم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ کس طرح اس شخص کا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کر حطب کو بتائے کہ اس..... اس شخص نے میری سوچوں پر قبضہ کر لیا ہے۔

مجھے اپنا امیر کر ڈالا ہے۔

اور وہ واقعی انجان تھا یا اغماز برت رہا تھا۔

بہر کیف... اتنا نادان، کم فہم تو وہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اسکی آنکھوں میں بچے مہکتے اپنے عکس کو نہ دیکھ اور محسوس کر سکے۔

”عینیہ! ادھر دیکھو۔“ وہ باری سے پکار رہا تھا مگر وہ رخ پھیرے کھڑی رہی۔

ایسا لگ رہا تھا اس کا تمام مظنہ بہہ چکا ہو اور ساری خود اعتمادی برف کی طرح پکھل رہی ہو۔

وہ اس کے پلٹنے کا انتظار کرتا رہا پھر اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک ڈائری اٹھائی اس کا ایک سادہ صفحہ کھولا اور پین اٹھاتے ہوئے بولا۔

”جہیں کیا پریشانی تھی وہ کوئی اہم وجہ تھی جس نے تمہیں دل جمعی سے پڑھنے نہ دیا۔ یہ ریزن تم اس میں لکھ دو۔“ وہ یوں بول رہا تھا جیسے کسی کم سن بچے کو پچکار رہا ہو۔ وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ڈائری کے اوپر پین رکھتے ہوئے بولا۔

”میں ہاتھ لینے جا رہا ہوں اس عرصے میں چاہو تو تم میرے اس مشورے پر عمل کر سکتی ہو۔ آگے تمہاری مرضی۔“

اس نے بس ایک نظر اس پڑالی اور بیڈ پر پڑا تو لے اٹھا یا وارڈروب سے اپنا چنگ
کیا سوٹ نکال کر ہاتھ روم میں بند ہو گیا۔

وہ کتنی دیر کھڑی اس مشورے پر سوچتی رہی کہ عمل کرے یا نہ کرے۔ پھر جیسے کسی
جذبے نے اسے کھینچا تھا۔ وہ آگے بڑھی احتیاطاً ہاتھ روم کے دروازے پر نگاہ ڈالی ایک
مہری سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر نفضا کے سپرد کی اور بال پوائنٹ اٹھا کر ڈائری پر لکھنے
لگی۔



”ارے میں پوچھتی ہوں کیا اکلوتی اولاد ہونے کا مطلب ہے اسے سر پر چڑھا
دیا جائے۔ یہ سارا کیا دھرا اس کے باپ کا ہے۔ آنکھوں کا تار بنا کر رکھا ہوا ہے پھر تو یہی
دن دیکھنے ہوں گے۔“
شرمخت براخروختہ ہو رہی تھی۔ اماں جان نے اسے فہمائشی نظروں سے گھورا
اور جھنجھلا کر بولیں۔

”اب ختم بھی کر شرہ۔ رات گئی بات گئی۔ تم تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہو بچی کے۔
لو پڑھائی نہ ہو گئی کوئی رودخشا کا حساب کتاب ہو گیا جس میں فیل ہو گئی۔“
”ہاں شرہ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ بھلا آج سے پہلے اس نے کبھی تمہیں باپوں
کیا ہے۔“ شمن بھی اسی کی طرف داری کرتے ہوئے بولی تو شرہ کے سینے سے ایک کھینچی
کھینچی اعصاب شکن سانس برآمد ہو گئی۔

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہی بات تو تشویش میں مبتلا کرتی ہے کہ اب کیا
ہو گیا ہے اور کیوں ہوا ہے۔

انہوں نے سر جھٹک کر تپائی پر رکھا جائے گا لٹھ لیا جس پر گلدلی سی تہہ جگمگاتی تھی

جو اس کے ٹھنڈی ہو جانے کی غمازی کر رہی تھی۔

”اب یہ ٹھنڈی ٹھار جائے گی۔ لاڈیہ دے دو میں گرم لے آتی ہوں۔“ شمن
نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا اور وہ یونہی بے خیالی میں ہنسی رہی۔

”پڑھائی تو ہوتی رہے گی۔ تم اس کی شادی کا سوچو۔ اب فہد نے الگ باہر جانے
کی رٹ لگا رکھی ہے مگر تیسرا کسی بندھن میں باندھے بغیر بھیجے گا نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو
میں بھی دل سے نہیں چاہتی کہ چھڑے کنوارے کو باہر بھیج دیا جائے۔“

اماں جان ٹیکے کے نیچے سے تسبیح نکالے بول رہی تھیں۔ شرہ نے چونک کر ان کی
شکل دیکھی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے اب مجھے جلد ہی اس فرض سے فارغ ہو جانا
چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے کمرے میں داخل ہوتی شمن کو دیکھا اور بولیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے شمن؟ اماں کہہ رہی ہیں فہد کو تیسرا بھائی نکاح منگنی کرنے
کے بعد ہی بھیج سکتے ہیں۔ کتنے سال کے لئے وہ جانا چاہ رہا ہے؟“

شمن چائے گاگ اسے دے کر اماں کے تخت پر بیٹھ گئی اس موضوع پر اس کا چہرہ
کچھ کھل اٹھا تھا۔

”ہاں تیسرا اور خود میں بلکہ اماں بھی یہی چاہتے ہیں مگر تم اور سلمان بھائی کچھ
عند یہ دو تو بات بنے نا۔“

ان کی بات پر شرہ بے ساختہ ہنس دی۔

”لو میرے عندیے کی کیا بات ہے۔ یہ تو سمجھن سے طے ہے کہ عزیہ تمہاری اور
نیور بھائی کی بیٹی ہے اور فہد میرا بیٹا ہے۔ یہ رشتہ تو ہم یعنی کے پیدا ہوتے ہی طے کر چکے

ہیں۔“

”بچپن کی بات اور ہوتی ہے شہرہ۔ اتنا وقت گزر جائے تو کیا سے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ ذہن بدل جاتا ہے سوچیں خیالات بدل جاتے ہیں۔“

شمن سنجیدگی سے بولی۔ شہرہ کا دل ایک لچلے ہڈ کا۔ اس کے تصور میں عینہ کا سراپا لہرایا۔۔۔ ایک سوچ نے ڈنک مارا۔ اس سے پہلے کہ بیٹی کا ذہن بدلے اس کی سوچیں بدلیں۔ اسے واقعی کوئی فیصلہ کر دینا چاہئے۔

گرم گرم چائے ہوٹوں سے نکرائی تو وہ چونکی پھر لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولیں۔

”میری طرف سے آپ اماں اور تیمور بھائی آج ہی عینی کو گٹھلی پہنا دیجئے۔ جب چاہیں آ کر رسم کر لیں اور چاہیں تو نکاح کر دیں۔ جو مناسب سمجھیں۔ میرے پاس تو وہ امانت ہے۔ آج نہیں تو کل آپ کو دینی ہی ہے۔“

شہرہ کی بات کے اختتام پر اماں اور شمن نے خرد کو انتہائی مسرد نظروں سے دیکھا۔ شمن کی تو مارے خوشی کے ہاتھیں کانوں تک جا پہنچی تھیں۔

”لو مجھے خبر ہوئی کہ اتنی بڑی خوشیوں پیٹھے پیٹھے آج ہی مل جائے گی تو میں کچھ ٹیٹھا دیکھا پکا ذاتی خیر فرخ میں کل کی رس ملائی تو رکھی ہوئی ہے ویسی لے آتی ہوں۔“ وہ لپک چھبک اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر بھاگی۔ شہرہ اور اماں بے اختیار ہنسنے لگیں۔



بڑی امید تھی کار جہاں میں دل سے مگر
اسے تو تیری طلب میں خراب ہونا تھا
عمر کتنی دیر ڈائری کو گھورتا رہا۔ اس پر لکھے الفاظ اسے ابھی ہوئی کر لیکروں کی
طرح محسوس ہونے لگے تھے۔ اسے اپنے ذہن پر شدید قسم کا دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔

یہ کوئی اس کی توقع کے خلاف نہ ہوا تھا وہ کچھ اسی طرح کے رد عمل کے لئے تیار تھا۔ اس کے باوجود کوئی چیز اس کا دل مٹنے لگی تھی۔ روح میں چٹکیاں بھر رہی تھی۔
ڈائری بند کر کے اس نے بھیجی بھیجی سانس بھری اور ڈائری بے دلی سے رائٹنگ ٹیبل پر پھینک دی اور کھڑکی کی سلائی کھول کر باہر لان کے سناٹے کو گھورنے لگا۔
شام ڈھل رہی تھی۔ ملک جاسا اندھیرا ہر شے کو ڈھانپ رہا تھا۔ ہوا سا کن تھی ایک پتا تک ندھل رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ہر شے کو کسی نادیہ خوف نے چپ کی مہر لگا دی ہو۔
ایک وحشت سی برقی محسوس ہو رہی تھی ہر پودے سے۔

اس نے اچانک لب بھیج کر سلائی ایک کھٹکے سے بند کیا پھر سلائی کے ہیشے کو گھورتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ایک دو گہری گہری سانسیں لیں اور پلٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ اور شہرہ جا چکی تھیں۔ صبح سے نظر آنے والی چہل پہل دم توڑ چکی تھی۔ شمن اپنے کمرے میں تھی وہ اماں جان کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اپنے تخت نما پلنگ سے ٹیک لگائے تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں اور پاؤں سمیٹ کر اپنے قریب ہی جگہ بنائی۔

”چلو تمہاری بھی شکل نظر آئی۔ میری بھی عید ہوئی۔“ اپنا تبت بھرا شکوہ ہمیشہ کی طرح کیے بنا نہہر سکیں۔ اب تو وہ عادی ہو چکا تھا مسکراتے ہوئے ان کے برابر تک گیا۔

”سارا سارا دن آفس میں سرکھپاتے ہو اور پھر آتے ہی کمرے میں بند ہو جاتے ہو۔ ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے اس میں بھی تم باپ بیٹے کی شکل نظر نہیں آتی۔ وہ الگ فائلیں تھامے گھر میں گھومتا ہے اور چشمہ چڑھا کر ان کا غڈوں میں سرکھپانے لگتا ہے۔“
وہ ہنس رہا تھا کیا کہتا شکوے بجای تھے وہ اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہی رہتا تھا۔

باپ کا سارا کاروبار سنبھال لیا ہے تم نے، ایک وہ فہد ہے کہ کدکڑیاں مارتا پھرتا ہے۔

یہی تو عمر ہوتی ہے دادی جان کہ کدکڑیاں مارنے کی۔ سمجھ آ جائے گی وقت کے ساتھ۔

وہ ادنچا ہو کر گاؤں کیلئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اماں نے چشمہ کے اوپر سے اسے گھور کر دیکھا۔

”بچہ ہے وہ۔ صرف تین سال ہی تو چھوٹا ہے تم سے اس عمر میں بھی سنجیدگی اور چنگلی نہیں آئے گی تو کب آئے گی۔“

”چنگلی کے لئے عمر کی ضرورت نہیں ہوتی یہ تو ایک لمحہ ہوتا ہے کوئی لمحہ زندگی میں ایسا آتا ہے انسان بدل کر رہ جاتا ہے سر ہاتھ۔“ اس نے دھیر سے سے سانس خارج کی اور

بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذرا سا مسکراتے ہوئے بولا۔

”شکر کیجئے وہ پچھو کر نہیں ہوا۔ ورنہ آپ کو اس سے بھی شکوے ہونے لگتے کہ وہ بھی شکل نہیں دکھاتا کہ کدکڑیاں لگاتا نظر نہیں آتا۔“

”اچھا بس..... رہنے ہی دو تم تو۔ یہ بتاؤ اب شادی بھی کرنی ہے یا اسی طرح ہی گھومتے رہو گے۔ دیکھو میاں میں کہتی ہوں سیدی سیدی اپنی پسند بتا دو۔ فہد سے پہلے میں تمہیں کھونٹے سے باندھنا چاہتی ہوں۔“

وہ تسبیح کیلئے کے نیچے ڈال کر باقاعدہ نارنگی سے گویا ہوئیں۔

”اوئے سوئے یہ کہے کھونٹے سے باندھا جا رہا ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔“ فہد اماں کے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو اماں کا جملہ سماعت سے ٹکرایا۔ وہ کرسی کھینچ کر وہیں آ کر بیٹھ گیا۔

عمر نے مسکراتی نگاہ فہد پر ڈالی۔

”اس کی بات کر رہی ہوں۔ شادی کر رہی ہوں اس کی۔ میں پکا قصد کر لیا ہے۔“

اماں جان گویا غریب تھی۔

کس کے نصیب اتنے روشن تاباں ہو رہے ہیں۔ وہ کون خوش نصیب ہے ذرا میں بھی تو سنو۔ مبارک ہو بھئی بہت بہت مبارک۔“ فہد یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر عمر سے بھنگیر ہونے کو اس کی ست جھکا تو اماں نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

”ارے یہ لڑکا مانے تو کسی کا نصیب کھلے گا۔“

انہوں نے عمر کو گھورا پھر قطعی لہجے میں بولیں۔

سن لو کان کھول کر اگر تمہاری کوئی پسند نہیں ہے تو بس پھر یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اور سن ڈھونڈ لیں گے کوئی۔“

”آں..... آں..... آں..... آپ..... ڈھونڈیں گی۔“

فہد نے آنکھیں پھاڑ کر اماں جان کر دیکھا پھر مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

آپ یہ کام نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اپنے چھٹی سو سال کی بڑھیا ٹاپ کی لے آئیں گی۔ کیوں کہ آپ کو تو آج کی ہڑل کی مغرب زدہ فیشن اسٹیل نظر آتی ہے۔ آپ کہیں

گی موٹی پر کئی تھی ذرا نہ بھائی کسی کے منہ میں چوہنم دیکھ لیا تو غرلی کہہ دیں گی۔ کس نے انگلیں جھاڑ دی تو اس پر تو انگریزی کا ٹیپ لگ جائے گا۔“

فہد کی شرارت پر عمر مسکرائے جا رہا تھا جب کہ اماں ادھر ادھر کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھیں۔ جو فہد کو کھینچ کر مارکیں پھر جھک کر چہل ہی اٹھالی اور ٹھائیں سے اس کے گھٹنے

پر دے ماری۔

چل جھونکا کہیں کا۔ آج تک میں نے کسی میں عیب نہیں دکھا لے۔ خدا نہ کرے مجھے

کیوں بچیاں عیب دار نظر آنے لگیں۔“ انہیں اپنے اوپر یہ الزام ذرا نہ بھایا تھا۔
”مجھے تو ساری بچیاں ہی اچھی لگتی ہیں بس یہ مانے تب نا۔“ ان کی تان پھر عمر پر آ کر ٹوٹی۔

خدا خیر کرے۔ ساری زور کس پر ہوا ساری پر۔ واہ عمر پھر تو عیش ہو گئے۔ ایک نہیں ”ساری“ مل رہی ہیں۔ میری مانو تو ایسا گولڈن چانس مس مت کرو فوراً سے پیشتر ہاں کر دو۔“

فہد نے پھر اماں جان کو چڑا دیا وہ اسے گرم نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر بولیں۔

”تجھے بھی نکیل لگے گی تب ہی سدھرے گا۔ شن تو کل ہی شرہ کے یہاں جا کر عینہ کو انگوٹھی پہنائے جانے پر کمر بستہ ہے۔ بس میں نے ہی روک رکھا ہے۔“ وہ اب فہد سے مخاطب تھیں۔

”شرہ آئی تھی کل اور اپنی رضا مندی دے گئی ہے۔ تیور اور میرا یہی خیال ہے کہ تمہارا نکاح کر دیا جائے۔ پھر ہی باہر بھیجا جائے الگ جان کو آگے ہو تم ہم سب کی۔ اب اسی شرط پر بھیج سکتے ہیں تمہیں۔“

”کیا.....؟“ فہد گویا دو فٹ اچھلا تھا کرسی سے پھر بجائے کرسی پر بیٹھنے کے اماں کے تحت پر آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا کیا..... کیا کیا پاپانے باہر جانے کی اجازت دے دی آخا..... اوہو۔“ وہ بیٹھے بیٹھے اچھلنے لگا اور اماں سے لپٹ گیا۔

آپ کتنی سوئٹ ہیں دادو۔ کتنی لوگ ہیں۔“ وہ چٹ بٹ ان کا منہ چومنے لگا تو انہوں نے اسے پرے دھکیلا۔ اچانک وہ چونک کر بولا۔

”مگر دادی جان ایہ..... یہ معنی اور نکاح کا کیا ذکر یہاں۔ وہ بھی اس احمق بانگڑو سے۔ یا اللہ یہ میری سماعت پر دھوکا تو نہیں ہوا۔ ذرا دادو بار کہیے کچھ ایسی بات کہی کہ میں ہی غلط سمجھا۔“

”باز آ فہد اپنی شرارتوں اور غیر سنجیدگی سے۔ ٹھیک سنا ہے تمہارے کانوں نے۔ نکاح ہو گا تمہارا عینہ سے۔ پھر ہی تمہیں جانے کی اجازت دی جائے گی۔“

”کیوں یہ دم چلا گا کر آپ لوگوں کو کیا میری شرافت کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ میرا کتوارہ پن آپ کو اس قدر بے اعتبار محسوس ہوتا ہے۔“ وہ کسی کم سن ناراض بچے کی طرح منہ پھلا کر اماں کو دیکھنے لگا تو وہ ہنس پڑیں۔

پھر وہ مصنوعی ناراضگی ایک طرف ڈال کر بولا۔
”واقعی پاپانے باہر جانے کی پریشانی دے دی ہے ناں۔“ اس کا لہجہ اب بھی کچھ کچھ بے یقین سا تھا۔ اماں جان سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

”ہاں مگر اسی شرط پر۔“
”ارے مان لیں گے مان لیں گے۔ ساری شرطیں مان لیں گے بس ایک بار باہر جانے تو دیں۔“ وہ ایک بار پھر اسی خوشی سے دو چار ہو گیا۔ تخت سے اٹھتے ہوئے ذرا ساما جبکہ کر پھر اماں کو چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

”پھر پھر ذرا ای سے کنفرم تو کر لوں۔ آپ کا کیا بھروسہ یونہی بھلانا نہ کہہ دیا ہو۔“ اور اماں جان کا ہاتھ چیل کی طرف اٹھادیکھ کر چھپا کے سر سے نکل بھاگا۔

”لو دیکھو ذرا اب میں اس عمر میں جھوٹ بولوں گی۔“ انہوں نے رخ عمر کی طرف کیا جو تخت سے اتر کر بیروں میں چلیں پھنسا رہا تھا۔

”تم کہاں چل دے ابھی تو تم سے نمٹنا باقی ہے۔ ارے تم دونوں بھائیوں کی جگہ

دو بیٹیاں ہوتیں تو کبھی کی پکڑ کر بیاہ دی ہوتیں۔ مجال ہے جو اتنا سرچڑھایا ہوتا۔ عمر میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ تم کدھر بھاگ رہے ہو۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے ذرا سارا کا مگر پلٹا نہیں۔

کان کھول کر سن لو۔ تم نے اپنی سی کر لی بہت اب ہمیں اپنی سی کرنے دو۔“ ان کے لہجے میں تنبیہ تھی وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور پلٹے بغیر ہی بولا۔

”ابھی میں نے اپنی سی کہاں کی ہے۔“ پھر وہ رکائیں اور اعصاب شکن احساس کے ساتھ کمرے سے باہر آ کر کی بورڈ سے گاڑی کی چابی لی اور پوریکو کی طرف نکل گیا۔



دل جنگل دل صحرا لوگو

دل جنگل دل صحرا

اڑتی بھرتی ریت کا دریا

سرد ہوا کا شور

کہیں کہیں کوئی دیپ سنگت

گھورا اندھیرا گھور

کبھی کبھی کوئی ہنسنے کا بدل

دھوپ رتوں کا زور

ڈالی ڈالی پھٹی پتکتیں

مکھیل ہوئی ڈور

دل پاگل دل ضدی بچہ

دل جنگل دل صحرا لوگو

دل جنگل دل صحرا لوگو

وہ واپس لوٹا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اماں جان کے کمرے کی بتی بجھی

ہوئی تھی البتہ لاؤنج کی بتی روشن تھی مگر وہ بے نیاز اپنے کمرے کی طرف بڑھا کہ ٹخن لاؤنج

سے باہر آئی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ احرام بھی لاڑی تھا۔ وہ سامنے ہی آ کر کھڑی تھی۔

اس نے سرسری انداز میں سلام کیا تو وہ سر کو جنبش کر کے جواب دیتے ہوئے بولیں۔

”کبھی ہمارے درمیان بھی رہو تو تمہیں کوئی جبر بھی سنائے۔“

وہ سر سے پیر تک جائزہ لیتیں نظریں ڈال کر دیکھے لہجے میں بولیں۔

یہ لہجہ اس کے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ مبہم سے انداز میں مسکرا دیا۔

”جو خبر آپ سنانا چاہتی ہیں اس سے میں پہلے ہی باخبر ہوں۔“ وہ قطعی اطمینان

سے کہتا ان کے دائیں طرف سے ہو کر آگے بڑھ گیا پھر اپنے کمرے کے دروازے کے

ہنڈل پر ہاتھ رکھ کر پلٹا تو وہ بھی رخ موڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جلدی سے بولیں۔

”تو اتنا نہیں ہوا کہ مبارک بادی ہی دے دیتے بھائی ہوا اس کے۔“

وہ اب بھی بغیر برامنائے اپنے چہرے کھڑا دیووں سے ناراض رہا۔

جیسی مسکراہٹ ہنوز اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر موجو رقص رہی۔

”اتنا کم طرف ہرگز نہیں ہوں کہ کسی کی غلطیوں اور کسی کی نفرتوں کا بدلہ کسی اور

سے لوں۔ دے دوں گا مبارک بھی مگر پہلے یہ کام اپنے تکمیل تک تو پہنچے۔ کوئی باقاعدہ رسم

تو ہو۔ فہد کو سب سے پہلے گلے لگا کر پیار کرنے والا میں ہی ہوں گا۔“

یہ کہہ کر ان کی طرف سے کسی قسم کے جواب کا انتظار کیے بنا کمرے میں جا کر

شانگسی سے دروازہ بند کر گیا۔

اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مفقود ہو چکی تھی اور ہونٹ سختی سے باہم بھینچ گئے

تھے۔ بدن پر پڑی شرٹ اتار کر ایک طرف پھینکی اسے ہی آن کیا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔



وہ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر کے دو دن بعد ”تیورولا“ آگئی تھی اس روز ڈائری میں لکھنے کی حفاقت کرنے کے بعد وہ حوصلہ ہی نہ کر پائی تھی اس کا سامنا کرنے کا۔ مگر اب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر ادھر آگئی مگر آئی بھی صبح کے وقت۔ اس کا خیال تھا بلکہ اسے پکا یقین تھا کہ وہ تیور انکل کے ساتھ آفس کے لئے نکل گیا ہو گا۔ مگر اس کا سانس سینے میں دب کر رہ گیا۔ جب وہ لان میں ہی کھڑی مانی سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دیا۔

اس نے چا کٹر اگر گزر جائے مگر وہ اسے دیکھ چکا تھا اور مانی کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے انکی طرف چلا آیا۔ وہ وہیں ٹاریل کے سنے کے ساتھ گویا چپک سی گئی۔ سائیڈ پر چنبیلی کی باڑھ کی شاخیں لہرا رہی تھیں وہ ادھر ہی آ کر رکھا تھا۔

”کک۔ کیسے ہیں آپ“ وہ نظریں جھکا گئی۔

جیسا دکھائی دیتا ہوں۔ خود دیکھ لو کیسا نظر آرہا ہوں۔“ اس کا انداز پر گھٹتہ سا تھا۔

عینہ کو اپنی ہتھیلیاں ٹھنڈی پڑی محسوس ہوئیں۔ ذرا سا چہرہ اٹھایا مگر پلکیں اٹھانے

سکی۔

”آؤ۔ ادھر بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ لمحے کے توقف کے بعد وہ

بولتا تو اس نے یک بیک پلکیں اوپر اٹھائیں پھر قدرے شہا کر بولی۔

”آ۔ آپ پلیز۔ وہ ڈائری کا ذکر کس سے بھی مت کیجئے گا۔“

وہ کین کی خوش نما کر سیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، فٹپک کر رک کر اس کی طرف

دیکھنے لگا۔ ایک دو لمحے دیکھتا رہا پھر بھاری مگر دھیمی آواز میں بولا۔

”بس۔ اتنی ہی ہمت تھی۔ محبت تو بے خوف اور نڈر بناتی ہے۔ خوف تو محبت کی

صدافت کو مشکوک بناتا ہے۔ جسے چاہا جائے اسے تو کم از کم بے خوف ہو کر یقین دلایا جائے۔“

وہ سن ہی ہوئی تھی۔ اسے اپنے اعصاب پر ایک ارتعاش طاری ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اس کے بے حد قریب آ کھڑا ہوا تھا اتنا کہ اسکی آنچ وہ اپنے دل پر محسوس کرنے لگی۔ اسے اپنا دل سینے کی دیوار سے کسی دیوانے کی طرح ٹکراتا محسوس ہونے لگا۔ مگر وہ اس کے دل کی دنیا سے بے خبر۔ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بے حد نرمی سے رکھ کر ہلکا باؤ ڈال رہا تھا۔ یوں جیسے بادباص کسی بھار میں کھٹنے والے شٹو نے کوہو لے سے چھوئے۔

وہ کتنی دیر اپنی جگہ کھڑی اپنے دل کی دھڑکنوں کے شور کو سنتی رہی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ جا چکا ہے۔ چونکی تو وہاں اب وہ تھا تھی بس اس کی آواز کی خوشبو کھری ہوئی تھی۔

اس کے وجود سے اٹھنے والی مہک کا احساس باقی تھا۔ اس نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری اور اپنے ہاتھ کو دیکھا جہاں اب بھی ہلکا سا ارتعاش طاری تھا۔ اسے لگا جیسے کوئی طوفان اسے چھو تا گزر رہا ہو۔ مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ طوفان گزرنے کے بعد تنہا یاں نہیں آئی تھیں بلکہ ایسا لگ رہا تھا دل کے شٹو نے اور کھڑے ہونے کے جذبے بھر رہا ہو کر لہلہانے لگے ہوں۔

محبت اپنی تہدی کے ساتھ رواں ہو گئی ہو۔

اس نے اس کا رو کو پور ٹیکو سے نکلتے دیکھا پھر وہیں چنبیلی کی باڑھ سے لگ کر کھڑی ہو کر آنکھیں موند لیں۔

اسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں

اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

وہ اندر جانے کی بجائے چپکے سے باہر نکل آئی اور گھر کی طرف چل دی۔
 شمن مٹھائی اور عینہ کیلئے دو جوڑے اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں آ کر دے گئی
 تھی اور جھکو باقاعدہ رسم کرنے کا بھی کہہ گئی تھیں۔ شمرہ نے یہ ساری چیزیں اسے دکھائیں
 تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے اعصاب پر زبردست پتھر پڑا تھا۔

”کب کیسی رسم کیا مطلب؟“

”کس بات کا مطلب۔“ شمرہ نے ابرو چکا کر اسے دیکھا۔ اس کے رویے کی
 حیرانگی اور چہرے پر پھیلنے والے اضطراب نے انہیں جیسے اندر ہی اندر خبردار کر دیا کہ وہ اس
 کے لئے قطعی تیار نہیں تھی اپنی طور پر۔

”ای ایلیز یہ مذاق چھوڑیں میں۔“

”یہ مذاق نہیں ہے جھکو تمہاری معافی ہے فہد کے ساتھ اور اسی مہینے کے آخر میں
 باقاعدہ نکاح بھی ہو جائے گا۔ فہد باہر جانا چاہ رہا ہے اس لئے یہ سب وقت سے پہلے کرنا پڑ
 رہا ہے اور یوں بھی میں بھی چاہتی ہوں کہ میں اس فرض سے جتنی جلدی ہو سکے سکدوش
 ہو جاؤں۔ آج نہیں تو کل ہونا تو ہے ہی۔ پرنیک کام میں دیر کیوں کریں۔ دیکھو یہ جوڑا
 کس قدر پیارا ہے۔ تمہیں گولڈن براؤن رنگ پسند ہے نا؟ شمرہ ڈبے سے کا مدانی کا جوڑا
 نکال کر اسے دکھانے لگی۔ اور وہ پتھر کی طرح ساکت اپنے بھاری ہوتے وجود کے ساتھ
 جیسے دھیرے دھیرے ڈھلے رہی تھی۔ اگر کسی کا سہارا نہ لیا ہوتا تو ضرور لڑکھڑاتی۔

”شمن نے کہا بھی تھا کہ عینہ کو لے جاؤں گی اس کی پسند سے کپڑے لوں گی مگر
 میں نے منع کر دیا۔ تمہیں سرپائز دینا چاہتی تھی۔ ہاں نکاح کا جوڑا تمہاری اپنی پسند کا ہی ہو
 گا۔

”ای ایلیز، چپ ہو جائیے۔ چپ ہو جائیے۔“ وہ اچانک جذباتی انداز میں حلق پھاڑ کر

جینتی۔ پھر وہیں ان کے قریب بیٹھ کر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔
 ”عینہ..... عینہ“ یہ کیا پاگل پن ہے۔“ شمرہ کا دل لمبے بھر حیرت اور دکھ سے
 کٹا۔ مگر دوسرے پل وہ لہجے میں کرختگی سموکرا اس کا سر اونچا کرنے لگی مگر اس نے ان کا ہاتھ
 جھٹک دیا۔

”میں فہد سے شادی نہیں کروں گی ماما۔ ہرگز نہیں آپ لوگ مجھے بتائے بغیر
 میری زندگی کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔“ ”نونیو۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیٹھ پر رکھی چیزیں ادھر
 ادھر بکھیر دیں۔ چپل کا ڈبہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

”یہ سب..... یہ سب میری خوشی کیلئے ہے۔ میں۔ میں۔ میں فہد سے شادی۔“

اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ شمرہ کا ہاتھ پوری قوت سے اس کے چہرے پر پڑا
 تھا۔ اور چند لمبے کے لئے دونوں ہی ساکت ہو گئیں۔ وہ دکھ اور گہرے صدمے سے ماں کا
 چہرہ نکلنے لگی جبکہ شمرہ اذیت اور ندامت کے احساس کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ پھر ایک
 گہری سانس بھر کر بیٹھ سے اترتے ہوئے بولیں۔

”میری محبت کا یہ صلہ دوں گی تم۔ ایک ماں سے گستاخی کرو گی۔ یہ سب تو ہم نے
 تمہاری خوشی کے لئے کیا ہے۔ شمن تمہیں اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہے۔ تم یہ صلہ دوں گی
 اسے۔“

”مجھے کب ان کی محبت سے انکار ہے۔ مگر فہد ہی کیوں عمر بھی تو ان ہی کا بیٹا
 ہے۔“

”عینہ“ شمرہ نے اسے کھانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

وہ جس خوف کی آہٹیں کب سے محسوس کر رہی تھیں وہ آ خر کار ان کے دروازے
 کے اندر قدم رکھ چکا تھا۔ وہ یقین بن کر آج سفاک حقیقت کی طرح سامنے تھا۔ وہ ان کے

لجے کی گرمی سے قطعی متاثر نہ ہوتے ہوئے اور درک صرف عمر کا نام لیتی رہی۔

”اگر عمر سے نہیں تو پھر کسی سے بھی میری شادی نہیں ہوگی۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی تھی اور شمرہ کسی بوسیدہ درخت کی طرح کرسی پر گرسی گئیں۔ تو عمر تم نے، تم نے آخر کار یہ جنگ جیت لی۔ مجھ سے درپردہ انتقام لے لیا۔ مگر نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں۔ میں تمہارا یہ مشن ہرگز پورا نہیں ہونے دوں گی۔ آئی ہیٹ یو۔ تم۔ تم میری بچی کے بالکل بھی قابل نہیں ہو۔“

وہ غصے سے انھیں اور ساری چیزیں سیٹھ کر الماری میں رکھ کر کمرے سے باہر آ گئیں۔ ان کے قدم پورٹیکو کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے وہیں سے ڈرائیور کو آواز دی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔

کچھ دیر بعد ہی وہ تیمور دلا میں اماں جان کے پاس بیٹھیں بے آواز رو رہی تھیں۔

اماں جان عینیہ کی طرف سے ہونے والے انکار پر دنگ سی رہ گئیں۔

”آخر کیا خرابی ہے فہد میں؟ کیوں انکار کر رہی ہے کیا وجہ ہے؟“

”وجہ جو بھی ہو مجھے اس سے سروکار نہیں ہے اماں بس آپ اسے سمجھائیے۔ کسی طرح سختی سے، نرمی سے۔ اور ہاں جمعہ کو آکر انگوٹھی پہنا جائے گا۔ اس نے بھی ابھی میرا پیار دیکھا ہے غصہ نہیں۔“

”تو دیکھو ذرا۔ آج کی نسل کا تو داماغی ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔ بزرگوں کے فیصلے قبول نہیں ہیں انہیں۔ ماں باپ بھلا برا جاتے ہیں ان کا تم فکر مت کرو شمرہ میں کل ہی آئی ہوں اس کا داماغ ٹھکانے لگانے۔ اماں جان نے سخت برا مانا تھا۔ انہیں عینیہ کا یہ طرز عمل بہت کھلاتا تھا۔

وہ وضو کیلئے غسل خانے میں چلی گئیں۔ شمرہ وہیں تخت پر لیٹ گئی۔

ان کا داماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ بیٹی کے اس قدر بے چلک انکار نے انہیں شدید دھچکا پہنچایا تھا۔

شمن گھر میں موجود نہیں تھیں۔ فہد کیساتھ بازار گئی تھیں وہ اس کے آنے سے پہلے ہی چلی گئی اور اماں کو بھی کہہ دیا کہ شمن کو ابھی کچھ خبر نہ ہونے پائے۔ نہ تیمور کو کچھ بتایا جائے مگر آخر کب تک یہ بات چھپ سکتی تھی۔ عینیہ نے رورور کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ باپ کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے شمرہ کی بجائے بیٹی کی حمایت کی۔

”آ خر فہد اور عمر میں فرق ہی کیا ہے۔ ایک ہی خاندان کے لڑکے ہیں دونوں۔ دونوں ہی جیسے ہیں تمہارے۔ فہد نہ کسی عمر کسی۔ یوں بھی وہ بڑا ہے پہلا حق اسی کا بنتا ہے۔“

اور شمرہ سر ہٹا کر رہ گئی۔

ادھر اماں جان کے علم میں بھی انکار کی وجہ آئی تو وہ چپ سی ہو کر رہ گئیں۔ ان کے خیال میں ”وجہ“ کچھ نامناسب بھی نہ تھی۔ وہ عمر کو پسند کرتی تھی۔ اسے اس نظر سے دیکھتی تھی۔ تو اس میں برا بھی نہیں تھا۔ اسے کب بتایا گیا تھا کہ بچپن سے ہی وہ فہد سے منسوب ہے۔

انہیں فہد سے دشمنی نہ تھی۔ مگر عمر سے جو قلی لگاؤ تھا اس کے پیش نظر انہیں عینیہ کے اس فیصلے سے شاک نہیں لگتا تھا بلکہ ایک طرح کی مسرت ہوئی تھیں۔

اور یہ خیال انہیں مطمئن بھی کر رہا تھا کہ۔ فہد کو کون سا دکھی ہوتا تھا۔ وہ بے پروا سا لڑکا تھا اسے اس سے سروکار نہ تھا کہ اس کی شادی عینیہ سے ہوتی ہے یا کسی اور لڑکی سے۔ جبکہ وہ عمر کو پسند کرتی تھی تو اسے اس کا جواز حق ملنا چاہئے۔ انہوں نے بھی شمرہ کو اس رخ پر سمجھانا چاہا تو وہ ہنستے سے اکھڑ گئی۔

”آپ جانتی ہیں اماں۔ کہ یہ عمر کبھی نہیں ہو سکتا۔“ میری دس بیٹیاں بھی ہوتیں

تب بھی میں عمر سے ایک بھی نہ بنی تھی۔“

جواباً اماں اے دل گرفتہ سی نگاہوں سے دیکھنے لگیں ان کے اندر ایک گہرا دکھ اتر گیا۔ انہوں نے کچھ بولنا چاہا تو مٹرہ نے تلخی سے ان کو روک دیا۔

”برائے مہربانی۔ مجھے کسی قسم کی نصیحت مت کیجئے گا۔ نہیں سنا مجھے کچھ بھی کوئی نصیحت واعظ وہ عینہ پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

عینہ نے اماں جان کی طرف دیکھا پھر اوروں سے چارگی آمیز کرب سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”امی اتنی سنگدل تو کبھی نہیں تھیں نانو۔“ وہ بولے سے سسک پڑی۔

”انہوں نے آج تک مجھے کبھی نہیں ڈانٹا میری ہر ضد پوری کی ہے۔ بلکہ میری طلب سے پہلے میری خواہش کو پورا کیا ہے۔ مگر اب وہ اس معاملے میں اتنی سنگ دل اور خالم کیوں بن رہی ہیں۔“

”تو آج تو ہی اس کی بات مان لے۔ اس کی خواہش پوری کر دے بیٹی۔“ اماں جان نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اذیت سے اوروں سے لگی۔

”نہیں نانو۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ میں خود کو اوروں پر مددگار نہیں رکھ سکتی۔ کیا آپ بھی چاہیں گی کہ میں ساری عمر کھتی ہوں۔ فہدی پر غلطوں بے غرض بے لوث محبت کے جواب میں اسے جھوٹی محبت دوں۔ کھوکھلی اور بے روح محبت دوں۔“

اماں جان اس کا چہرہ ہنکتی رہ گئیں۔ تب وہ ان کی گود میں سر ڈال کر دھیرے سے بولی۔

”نانو امی سے کہئے وہ مجھ سے میری زندگی کی ہر خوشی چھین لیں۔ مگر مجھے صرف

اور صرف عمر دے دیں۔“

وہ بولیں بولی جیسے کوئی بچہ اپنے من پسند کھلونے کیلئے بچل رہا ہو۔ اسے طلب کر رہا ہو۔

”پہلے اتنا چاہتی ہے اسے۔“ ان کا ہاتھ اس کے سر کے ریشمی بالوں میں اٹک گیا۔ وہ سر ہلانے لگی۔

”ایسا کیا ہے اس میں۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔ ان کی آواز جیسی تھی۔ جیسے کہیں بہت دور سے آرہی ہو۔ اور گناہیں کہیں خلاء میں مرکوز ہو گئیں۔

”پتا نہیں یہ سوال تو میں نے خود سے کئی بار کیا ہے نانو۔ اور جواب پتا ہے کیا آتا ہے۔“

”کیا؟ اماں جان نے بے اختیار اس کے اٹھے ہوئے سر کی طرف دیکھا۔ تو وہ روئی روئی آنکھوں اور دل کی افرودگی کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ان میں کوئی ایسا سحر ہے جو مجھے، میرے دل کو، اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کوئی متناطیس کشش ہے جو مجھے لوہا بنا کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے میں نہیں جانتی۔ یہ کب اور کیسے ہو گیا۔“

اماں جان کے سینے میں سانس، یوں خارج ہو گئی جیسے یہ سانس انہوں نے کب سے روک رکھی ہو۔ اور بدیشی مشکل سے رکاوٹیں توڑ کر باہر نکلی ہو۔

”ہاں! بالکل اپنی ماں کی طرح اس میں بھی ایسا کوئی سحر ہے جو جکڑ لیتا ہے مقابل کو۔“

”نانو، وہ ان کا کندھا ہلانے لگی تو وہ چونکی، پھر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے

پیا لے میں لیتے ہوئے بولیں۔

”چلو اٹھو۔ نماز پڑھو۔ خدا بہتر کرے گا۔“

”شرہ اپنی ضد پر قائم تھیں اور وہ اپنی بھوک ہڑتال پر مگر دو دن کی بھوک ہڑتال نے ہی اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ بستر سے الگ گئی تھی۔ اس میں اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک نوالہ کھانے کو تیار نہ تھی۔“



تیمور ولا۔ میں سب کے کانوں میں یہ خبر پہنچ چکی تھی مٹن کو خود شرہ نے فون پر روتے ہوئے اطلاع دی تھی اور وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ذہن کے پردوں پر وہ سارے منظر فلم کی طرف چلنے لگے۔ جب عینیہ تیمور ولا میں آ کر عمر کے کمرے کی طرف دوڑ لگاتی۔ وہ لان میں ہوتا تو وہ لان میں نظر آتی۔ ہر خیز پہلے اسے سنانے بھاگتی۔ گھنٹوں اس کے کمرے میں گزاردیتی۔

پتا نہیں اس وقت انہوں نے غور کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ فون سننے کے بعد وہیں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ بالکل چپ، مگم۔ جیسے اب نہ کچھ کہنے کو رہا ہونا سننے کو۔

انہیں لگا جیسے عمر نے نہیں ”شہلا“ نے اسے ایک بار پھر شکست دے دی ہو۔ ان کا رواں رواں جملنے لگا۔ اضطراب کی اہریں اندر سے اٹھ کر اندر ہی دم توڑنے لگیں۔ فہد کے مقابلے میں عمر کتنا عام سا تھا۔

”خدا جانے یہ عام سے لوگ دلوں پر کس طرح حکومت کر لیتے ہیں انہیں ایسا کن سا ہنر آتا ہے دل موہ لینے کا۔“

وہ انہیں اور لاؤنج کی دیوار پر لگے خوبصورت گولڈن فریم میں جڑے آئینے میں

اپنا چہرہ دیکھنے لگیں۔

گوری رنگت، جیسے نین نقش، ارد گرد بکھری ریشمی بالوں کی لٹیں۔ وہ آج بھی اتنی خوبصورت تھیں۔

کیدم آج میں نے نظر آتے اپنے بکس کے ساتھ دوسرا کس ابھرا یا۔ بے حد عام سا مگر وہی مسکراہٹ سے سجا۔ یہ مسکراہٹ سراسر افتخار سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں میچ لیں اور رخ موڑ لیا۔

دلوں کی جگہ گاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے پہلے
اس کے اندر سے ایک ہوک اٹھی، اسے یاد تھا وہ اس شعر پر ایک روز کتنا ہنسی تھیں
جب شرہ نے سنایا تھا اور ہنستے ہوئے اس نے وہ تصویر اٹھائی جب شرہ اسے کھانے لائی تھی۔
”یہ..... یہ چہرے دلوں کی بستیاں تاراج کر سکتے ہیں۔ ایسے چہرے حادث آجک وہ پھر کلکھلائی۔“

”تیمور۔ اس لڑکی سے شادی کر لے گا۔ ہا۔ اس۔ اس لڑکی سے۔ بھلا دیکھو اس میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے نہ رنگ نہ روپ، اف۔ کیوں مذاق کر رہی ہو شرہ۔ اب تمہارے حسین خور و بھائی کا میٹ اتنا بگس نہیں ہو سکتا، کہ اس شکل کو مجھ پر فوقیت دے۔“ وہ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آتا رہا تھا۔ اتنا پانی کہ سارے الفاظ بہہ گئے۔ پھر کچھ نہ رہا تھا کہنے کو۔

مئی۔ فہد کی آواز عقب سے ابھری تو وہ گہری سانس بھر کر بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پلٹیں۔

”مئی۔“ آپ ہی شرہ پھوپھو کو سمجھائیے نا، بے کاری ضد لے کر بیٹھی ہیں۔ میڈیکل

حالت دیکھی ہے آپ نے“ وہ تاسف اور اچھے انداز میں شمن کو دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”بچپن کے رشتوں ناطوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مئی۔ کیوں اس بچاری کو پابند کر رہے ہیں آپ لوگ۔ جب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور جبکہ عینیہ اپنی پسند بھی بتا چکی ہے تو عینیہ اسے اس کا جائز حق ضرور ملنا چاہئے۔ یقین کریں مئی۔ میں بالکل بھی ان ایزی فیل نہیں کر رہا۔ بلکہ بے حد خوش ہوں۔ ویسے مزے کی بات ہے“ وہ گھوم کر نیبل پر سجے شوخیں پر انگلیاں مارتے ہوئے شرابی انداز میں ابرو کو جنبش دیکر مسکرایا۔ عینیہ اور عمر کی جوڑی گلے کی شاندار اور دادو کی بھی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔ عمر کو کھونٹے سے باندھنے کی“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

”بول چکے تم۔“ شمن جو کب سے غصہ ضبط کر رہی تھی آخر کار چنچ پڑی۔
 فہد نے ذرا سا چونک کر ان کا تپا تپا چہرہ دیکھا۔ کچھ کہنے کو لب کھولے کے وہ پھسکارتے ہوئی بولیں۔

”ابھی تم سے کسی نے مشورہ نہیں مانگا ہے تم اپنے کام سے کام رکھو“ فیصلہ ہم بڑوں کے کرنے کے ہیں“ کیا بہتر ہے اور کیا نہیں“ ہم زیادہ سمجھتے ہیں۔“ وہ اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر لاؤنج سے نکل گئیں۔

”ممما بلیز بات سنیں“ بے شک فیصلہ بڑوں کے کرنے کے ہیں مگر جنکی زندگی کے بارے میں ہو رہے ہیں ان سے تو کم از کم پوچھ لیں۔ شادی کوئی کھیل تو نہیں ہے مہما۔“ وہ ان کے پیچھے بھاگا۔

”جب ہو جاؤ فہد۔ خاکے لئے چپ ہو جاؤ۔“ وہ زور سے چلائیں“ انہیں لگ رہا تھا کہ بیٹیوں پر رگوں کی بجائے لوہے کی سخت تاروں کا جال بچھ گیا ہو۔ وہ اپنے بیداروں میں گئیں اور دروازہ دھماڑے سے بند کر گیا۔



گھر میں عجیب سا ماحول ہو گیا تھا۔ یوں لگتا ہر کوئی دوسرے سے کچھ پکھنچا ہے۔
 فہد بھی اس دن کی ڈانٹ کے بعد اس معاملے سے الٹعلق بن کر بیٹھ گیا تھا۔
 عمر کی گہری خاموشی اپنی جگہ تھی۔ تاہم وہ معمول کے مطابق سب میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔
 اس دن تیوڈ شمرہ کے پاس آئے تھے۔ عینیہ کی خبریت دریافت کرنے اور اسے

دیکھ کر انہیں ذہنی جھٹکا لگا تھا۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اس نے؟“ وہ فریج سے کولڈ ڈرنک نکال رہی تھیں۔

”یہ تو آپ اسی سے پوچھیے۔“

”کیوں؟ اس سے کیوں تم سے ہی کیوں نہ پوچھوں؟ اسے اس حال میں

پہنچانے کی ذمہ دادر تم۔“

”کیا... میں؟“ وہ کولڈ ڈرنک کی بوتل ڈانٹنگ نیبل پر پٹخ کر حیرت اور دکھ سے

بولی۔ ”خدا اس نے پکڑ رکھی ہے“ مورد الزام تھے تمہارا ہے ہیں آپ۔“

تیوڈ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ انہوں نے اس کی چیخ کی ہوئی بوتل کو ایک طرف رکھ دیا اور نیبلے لگے۔

”بجائے اسے سمجھانے کے آپ مجھے ملیم کر رہے ہیں۔“

”تو کیا خرابی سے عمر میں کتم اسے رو کر رہی ہو۔“ انہوں نے رک کر بڑی تکیھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ لحظہ بھر وہ چپ ہو کر سر جھکا گئیں۔ مگر وہ ہنوز اسے ایسی ہی تکیھی اور گرم نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کیا وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ ان پڑھنے جا ملے بے روزگار بنے مگڑا ہوا اوباش ہے۔ معذور ہے“ بد کردار بنے بتاؤ کیا خرابی ہے اس میں؟“

”تیوڈ۔“

”چپ ہو جاؤ۔“ کچھ نہیں سننا چاہتا میں۔ تمہاری لنگڑی لولی دلیل۔“ انہوں

نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”کیسی ماں ہو تم۔“ بیٹی بستر سے لگ گئی ہے اور تم نفرت میں اندھی ہو بیٹھی ہو۔ تمہارے اور شمن کے سینوں میں بھری کدورتوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ تم دونوں کو نفرت کے جذبے نے بے اوسان کر دیا ہے۔ شمرہ تمہیں۔ تمہیں اپنا خون اپنا سگا بھتیجا نظر نہیں آتا۔ صرف اس کی ماں کا نکس دکھائی دیتا ہے۔ اپنی بیٹی نظر نہیں آتی“ اس کی خوشیاں دکھائی نہیں دیتیں ماضی کی اس بے قصور عورت سے نفرت نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ خود غرض بناؤ والا ہے“ جس ظالم بنا دیا ہے گرسن لو آج اور یاد رکھو۔ اگر عینیہ کی شادی

عمر سے نہیں ہو سکتی تو پھر فہد سے بھی نہیں۔ اگر یعنی بہو بن کر آئے گی میرے گھر میں تو صرف اور صرف عمر کی بیوی کی حیثیت سے اور کسی حیثیت سے نہیں۔ یہ فیصلہ میں عینہ کی حالت کے پیش نظر اور عمر کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلانی کے پیش نظر بھی کر رہا ہوں۔ آگے تمہاری مرضی، میری طرف سے اجازت ہے جہاں اور جس کے ساتھ چاہو اپنی بیٹی یہاں دو۔“

وہ اپنا آخری فیصلہ بے چنگ لہجے میں سنا کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”تیسو..... تیسو بھائی۔ بات تو سنیں۔“ شرہ دوڑ کر ان کے پیچھے لگی تھی۔

وہ رک تو مجھے مگر پلٹے نہیں۔ آنکھوں کی تہوں میں غصہ اُٹھ رہا تھا۔ پیشانی پر کلیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔

شرہ کی ساری ہمتیں جھماک کی طرح بیٹھ گئیں۔ وہ تیسو کی ضد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ فیصلہ کر کے بدلے نہیں تھے۔

اور اب عمر سے عینہ کی شادی نہ کرنا مطلب ہوتا ہمیشہ کے لئے اس گھر سے تعلق ٹوٹ جانا۔

ان کے دل پر چھڑا پڑا۔ وہ بھائی کے پتھر لیے چہرے پر نگاہ ڈال کر پھر چہرہ جھکا کر تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔

”آپ عمر سے پوچھ لیجئے گا۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔“

تیسو جھٹکے سے پلٹے تھے۔ پہلے تو بہن کو فوراً دیکھتے رہے پھر گہری سانس بھر کر ایک ہنکار ابھر کر سر ہلانے لگے۔ ان کی چہرے کے تنے زاویوں کی غٹائیں یکدم ڈھیلی پڑ گئیں۔

”مجھے تمہارے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ میں جلد عمر سے بات کرتا ہوں۔“ پھر

انہایت بھری نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ”عینہ میری بہو نہیں بیٹی بن کر آئے گی۔ وہ عمر کی بیوی بن کر جتنی خوش رہے گی اتنی فہد کی نہیں۔ اس کی میں ضمانت دیتا ہوں۔ تم سچائی کی آنکھ سے دیکھو تو خود میری بات کی تائید کر دو گی۔“

وہ چلے گئے۔ شرہ کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح، جہیں رکھی کر سی پر بیٹھ گئی۔

ادھر کھڑکی سے لگی عینہ کو اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

تیسو کی آواز خوشبو بن کر اس کی سماعتوں سے نکل گئی تھی۔

اسے ماں کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ عمر کے لئے رضا مندی دے رہی تھیں۔ اس نے تیسو کو خوشی سے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ پھر شرہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور اسے لگا جیسے اس کے اندر کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔ اس کی کھری تو انہاں یان یکدم سہٹ آئی ہوں..... تمام تر کمزوری زائل ہو گئی ہو اور وہ پھر سے چاک وچو بند ہو گئی ہو۔

خوشی کا احساس مقوی کھانوں سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اسے آج بتا چلا۔ محبوب سے ملنے کا خیال۔ آئرن کی ٹیبلٹ سے کہیں زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ اسے آج محسوس ہوا۔

وہ آج تین دن کی بھوک ہڑتال کے بعد رات کا کھانا پاپا کے ساتھ مل کر کھا رہی تھی۔ پاپا کی سرست آتمیز جھانگی پر شرہ نے انہیں مختصر آتھایا تھا اور بتاتے ہوئے ان کا چہرہ بڑا بے روق سا تھا۔ ان کے چہرے کے زاویوں میں خوشی کی رشتی تھی نہ تا گواریت کا رنگ۔

سپاٹ بے تاثر چہرہ تھا۔

مگر عینہ اپنی خوشی میں گن ماں کا چہرہ کہاں دیکھ رہی تھی۔

رات کھانے کے بعد اس نے امین کو فون کر کے یہ خوش خبری سنائی تو امین نے

بھی خوشی کا اظہار کیا پھر اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

”آئی تیار رہی تھیں تم بستر مرگ پر فائدہ کشی سے چور چور ہو اور ادھر میں تو اب انتظار کر رہی تھی کہ تم اپنے انتقال پر ہلال کی خبر سناؤ گی۔“

اس نے ریسیور کو گھورا جیسے وہ ایمن علوی ہو۔ پھر مصنوعی غٹکی سے بولی۔

”اور تم نے یقیناً سوئم کے لئے لباس بھی تیار کر دیا ہو گا۔ ہے نا۔“

”آف کورس... نہ صرف سوئم کے لئے بلکہ چہلم کے لئے بھی سوچ رہی تھی لہذا

وغیرہ ہوا لوں۔ آخر تمہاری بیسٹ فرینڈ ہوں۔“

”بے ہودہ.... بے سروت اور طوطا چشم لڑکی۔ افسوس کہ تمہاری یہ دلی آرزو پوری

نہ ہو سکی مگر افسوس مت کرو یہ لہذا تم میری منگنی والے دن پہن لینا۔“

اور جو اب ایمن کا چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ ریسیور میں گونج اٹھا۔

”ویسے چالاک لڑکی۔ کہیں یہ ڈراما اس لئے تو نہیں رچا رہی تھیں کہ۔“

اپنے سر جانے کی انگوٹھیں اڑا کر

اس کو اپنے گھر بلانا چاہتے تھے

اور جو اب عینہ نے ایک سر قسم کی آہ کھینچی۔

”ارے کہاں ایسی قسمت....“

”بڑا ہی تیز اڑ رہی ہو۔ ویسے عینہ۔ یہ دیوانگی اچھی چیز نہیں ہے۔“ وہ بکدم

خجیدگی کی لپیٹ میں آتے ہوئے ناسخاندانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”مجھے کبھی کبھی بڑا ہی خوف آتا ہے تیری اس دیوانگی سے۔“

”ارے۔ تمہیں کیوں خوف آتا ہے بھلا؟“ وہ زور سے نفس پڑی۔

”اس لئے کہ محبت یوں نہیں اچھی۔ اسے جنوں نہیں بناتے عینہ۔ یہ جنوں

بھول جاؤ۔“

”مس ایمن علوی۔ جسے واپس پلٹنا ہی نہ ہو وہ کیونکر واپسی کا راستہ یاد رکھے گا۔“

وہ دھیرے سے بولی تھی پھر۔ یکدم جیسے ماحول کی خجیدگی کو کاٹنے کی غرض سے بولی۔

یہ کہاں کی دقتی ہے کہ بننے ہیں دوست نا صبح

کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

ایمن بی بی خدا را تم یہ نا صبح کا رول پلٹے کر دو۔“

وہ ہم مزاجیہ انداز میں ہنسی ہو کر بولی تھی۔

پھر وہ دونوں کتنی دیراوت چٹانگ باتوں میں ہنستی رہیں۔ وہ یکدم ہی ہلکی پھلکی

گئی تھیں۔ ہنسی خود بخود دلوں سے آزاد ہو کر فضا میں سازی کی طرح بکھر جاتی۔

شمرہ اس کے کمرے کے باہر گزرتے ہوئے ٹھٹھک کر رہی تھیں۔ اس کی ہنسی کی

جھنکاریں اس کے دل پر یک ناسودہ سا احساس رقم کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دھڑکی اس کی ہنسی کی یہ مدھر جھنکاریں سنتی رہیں پھر لبوں کو دانتوں میں

دبا کر جو بھل بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف ہو لیں۔

رات بھر وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہیں۔

کبھی بی بی کی ہنسی کانوں میں بجنے لگتی۔ کبھی عمر کا سراپا لہر اجاتا۔

کبھی شبنم کی شکوہ کنائیں نگاہیں تو کبھی تیمور کا غصہ یاد آنے لگتا۔

صبح بھی بے چینی ختم نہ ہوئی تو وہ تیمور دلا چلی آئیں۔

شبنم اماں جان کے کمرے سے نکل رہی تھیں۔

شمرہ کو دیکھ کر اس کی نظروں میں خود بخود شکوے چل اٹھے.... اور شمرہ کچھ جھینپ

کر اس کی نظروں سے نگاہیں کترا کر اماں جان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

کراس کی نظروں سے نگاہیں کتر اکراماں جان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

پتا نہیں تینور نے گھروالوں کو کچھ بتایا بھی تھا یا نہیں یا وہ پہلے عمر سے بات کرنا چاہتا

تھا۔

مگر مرن کی نگاہوں کا شکوہ تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا کہ اس کے علم میں آ چکا ہے اور وہ سارا وقت مرن سے نظریں ہی نہ ملا پارہی تھیں۔ مرن کی خاموشی بھی بڑی سرد قسم کی تھی۔ اس نے ملازمہ کے ہاتھوں اسے چائے بھجوا دی اور خود وہ پھر کا کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی مگر جب شمرہ کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی تو وہ خود ہی مرن کے پاس چلی آئی وہ اپنے بیڈ روم میں تھیں۔ نیکہ کا غلاف بدل رہی تھیں۔ شمرہ کو دیکھا مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے شمرہ! مجھے تینور نے بتا دیا ہے کہ یہ خالص ان کا فیصلہ ہے۔“

شمرہ ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر دیوار سے لگ کر مرن کو دیکھنے لگی۔

جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو مگر کچھ بھی نہ کہہ پارہی ہو۔ کوئی لفظ گرفت میں نہ آ پا

رہا ہو۔

”مجھے تینور اور عینہ نے مل کر توڑ دیا مرن۔ ورنہ میں کبھی ایسا نہ ہونے دیتی۔ تم شکوے کرنے میں حق بجانب ہو۔ مگر خدا را میری مجبوری بھی کبھی نہیں ہے۔ میں ہوں کہ کس طرح تین دن تک سینے پر پتھر رکھا تھا مرن..... عینہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی..... مگر میں نے صرف اور صرف اس لئے برداشت کیا کہ۔“

”میں نے کہا تھا مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔ بس ان تقدیر سے ہے۔“

اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ شمرہ نے چوری نظریں اس پر ڈالیں پھر آنکھیں ایک

دو لمحے کے لئے موند کر کھولیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں کبھی ایسا چاہ سکتی ہوں۔“

وہ مرن کو دیکھنے لگیں جبکہ مرن کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے

میلی چادر اور غلاف کا رول بنا کر ایک طرف پھینکا اور الماری سے چلی ہوئی بیڈ شیٹ نکالنے ہوئے بولیں۔

”تمہارے نہ چاہنے یا چاہنے سے کبھی کچھ ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی....

چھبیس سال پہلے بھی جو ہوا۔ ایسا تم نہیں چاہتی تھیں مگر ہو گیا تھا۔“

شمرہ کے دل پر زبردست چوٹ پڑی۔ اس کی ہلکیں جھک گئیں۔ پھر وہ اضطرابی

انداز میں انگلیاں مسلنے لگی۔ وہی مانوس سی آگ بھڑکنے لگی۔ ساری رات اس نے اس

آگ کو ٹھنڈا کرنے میں گزار دی تھی۔

عینہ کی ہنسی کی پھوار نے ان شعلوں کو بجھانے کی کوشش کی تھی۔ مرن نے پھر ان

شعلوں میں تیل چھڑک دیا تھا۔

وہ اضطراب اور دل پر بوجھ سینے کمرے سے نکل گئیں۔ راہداری سے گزرتے

ہوئے عمر کے کمرے کے پاس لمحہ بھر ٹھہریں پھر ہونٹ بھینچ کر لاؤنج میں چلی آئیں۔

رات کے کھانے پر تینور اور عمر بھی موجود تھے۔ وہ اماں جان کے کمرے سے باہر

آئیں تو میز پر انہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ تینور شمرہ کو کچھ خوش دلی سے بولے۔

”آؤ..... آؤ شمرہ..... کیسی ہو؟ عینہ نہیں آئی ساتھ۔“

اس نے سر کٹنی میں ہلا کر کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے یونہی نظر بھر کر مرن کو دیکھا۔ ہلکے

گرے رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا اونچا لمبا سر لپا خاصا جاذب نظر دکھائی

دے رہا تھا۔

ت انگیز اور پائیدار زنجیر سمجھتا ہوں جو دونوں فریقوں کو باہم ایک دوسرے کی محبت میں جکڑ کر زندگی کو مکمل کرتی ہے۔“ وہ ایک دوسرے کے توقف کے بعد پھر بولے۔

”عینہ دراصل تمہیں پسند کرتی ہے اور اگر اس کا ذہن تمہیں قبول کر رہا ہے تو یہ اتنی معیوب بات بھی نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ فہد کی فکر مجھے اس لئے نہیں ہے کہ وہ بالکل غیر جانبدار ہے۔ اس نے ابھی تک ذہن میں کوئی خاکہ نہیں بنایا تھا۔“ تیمور اتنا کہہ کر چپ ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگے بلکہ میز پر موجود ہر کسی کی نظریں اس پر تھیں۔

وہ پلیٹ میں موجود کباب پر کچھ دیر تو کاٹنا مارتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر ہلکے سے مسکرایا تھا۔ یوں جیسے بڑے عرصے کے بعد کندھے پر رکھے بوجھ کو اتارنے کا وقت آیا ہو۔

بڑے دنوں بعد کوئی خوشی دل سے اتر کر دم میں پھیل گئی ہو اور اب ہی مسکرانے کا وقت آیا ہو، یقیناً محبت بڑا اچھا جذبہ ہے۔ یہ سلاب کی طرح حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے سامنے کی دیوار کسی رکاوٹ کو نہیں دیکھتا..... بلکہ اسے بھی تو ذکر بہا کر لے جاتا ہے۔ ایسا ہی عینہ کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بے خبر نہیں تھا۔ اس کی تین دن کی اس بھوک ہڑتال۔ اس کی بیماری سے..... ہاں بس مختصر تھا کہ کب یہ فاقہ مستی رنگ لاتی ہے کہ اس کی دیوانگی مضبوط دیوار کو توڑتی ہے۔

اس نے ٹمرہ کی طرف ذرا سی نگاہ کی۔ پھر تیمور کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

”آپ کی باتیں اپنی جگہ بالکل بجا ہیں۔ شادی واقعی باہمی رضامندی سے ہونی چاہئے مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ صرف عینہ کی اپنی خواہش ہے میری نہیں۔“

اس کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔
کوئی ایسی خوبی تھی اس میں جو اس کی شخصیت میں ایک سحر پیدا کر رہی تھی۔ اور وہی سحر نے عینہ کو جکڑ لیا تھا
وہ آج شاید ایک بڑے عرصے بعد اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔
پھر ایک گہری سانس بھر کر اپنی پلیٹ پر جھک گئیں اور چپ چاپ کھانے لگیں۔
”عمر تمہیں عینہ کیسے لگتی ہے؟“ کئی لمحے کی خاموشی کے بعد تیمور کی آواز ابھری تھی۔ وہ عمر سے مخاطب تھے۔ عمر نے حیرت سے سر اٹھایا تھا جبکہ ٹمرہ کو اپنے حلق میں نوالہ پھینکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھایا اور یوں سے نگالیا تھا۔
”بس ایک سوال ہے جو چاہا ہو جواب دو۔“ تیمور یہ کہہ کر ہنس دیے۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔ اور بولا ”اچھی خاصی ہے“
”اچھی خاصی نہیں بہت اچھی لڑکی ہے اور میں اس کا رشتہ تم سے کرنا چاہتا ہوں۔“ تیمور اس کی بات کے جواب میں بولے تھے۔ لہجہ بھر کے لئے میز پر مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر ٹمرن اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ ٹمرہ بھی بس اپنے نوالے سے ہی کھیل رہی تھیں۔
عمر نے البتہ بے حد اطمینان سے سر اٹھا کر باب کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔
”اچانک آپ کو یہ خیال کیونکر آ گیا۔ جبکہ میں تو سن رہا تھا کہ اس کی شادی شادی.....؟“ اس نے دانستہ جملہ پورا نہ کیا۔
”دیکھو عمر۔ شادی میرے نزدیک کوئی کھیل نہیں ہے۔ جب تک دونوں فریقین راضی نہ ہوں دل سے وہ میرے نزدیک شادی نہیں، محض سمجھوتہ ہوتا ہے اور سمجھوتے میں خوشیاں نہیں ملتیں۔ امنگیں اور دلوں کو توڑ جاتے ہیں۔ حقیقی سرتیں گم ہو جاتیں ہیں۔ شادی کو ہمارے یہاں واقعی جواب دیا کر رکھ دیا گیا ہے۔ جبکہ میں اسے ایک خوبصورت اور سر

اس کا خیال تھا اس نے یہ کہہ کر میز پر نہ سہی ٹمرہ کے دل پر ضرور دھما کر کیا ہے اور اس کا خیال درست ہی تھا۔ ٹمرہ تھرا آ میز بے یقینی کے ساتھ اسے سنبھال رہی تھیں۔
”میں بھی سمجھوتے کا قائل نہیں ہوں پا پا..... بہر حال ہر شخص کو پسند کرنے کا حق حاصل ہے وہ اگر مجھے پسند کرتی ہے اور اتنی شدتوں سے تو.... یہ اس کا پاگل پن ہے یا واقعی جذبات بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر میں اس کے لئے ایسے کوئی جذبات نہیں رکھتا۔“
اس کا لہجہ ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔

پھر وہ ٹمرہ کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے بہت دکھ ہوا کہ آپ نے اس کی تربیت میں کوتاہی کر دی۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر تعلیم پر توجہ دینے کی تھی۔ اتنی چھوٹی اور معصوم عمر تو ماں باپ کے فیصلے پر سر جھکانے کی ہوتی ہے تاکہ سرکشی کی۔“

اس کے لبوں کی تراش میں پھلی مسکراہٹ کچھ سنگتی سی استہزائیہ آ میز ہو کر لبوں پر نمودار ہو گئی۔ وہ اس دھیسے لب دیکھنے میں بولا۔
”اس عمر میں بھڑکنی آگ کی چمکتی لواڑ کیلئے کھائی دیتی ہے۔ جسے چھونے کی خواہش پھل جاتی ہے مگر وہ آگ کو چھونے کے بعد کی سیاہ کاریوں سے بے خبر ہوتی ہے مگر آپ تو سمجھدار اور میچور ذہنیں ٹمرہ پھوپھو۔ آپ تو اس آگ کی تباہ کاری سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسے باز رکھ سکتی تھیں۔“

وہ کہہ کر اسی اطمینان سے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔



عمر تیمور نے لفظوں کے جو طمانچے مارے تھے اس کی اذیت ٹمرہ اپنے دل کے رخسار پر کتنی ہی دیر تک محسوس کرتی رہی۔ انہیں اپنے اعصاب مثل ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ جیسے اب وہ اس کرسی سے کبھی نہ اٹھ سکیں گی۔ یونین پتھر کی سل کی طرح پڑی رہیں گی۔

خفت اور بیکاس کا احساس اس قدر شدید تھا کہ سر اٹھا کر اس کے خوشی سے دیکھنے سرخ چہرے کی طرف دیکھ بھی نہ پائیں۔

اور رات گئے جب خود کو گھسیٹتی ہوئی گھر لوٹیں تو انہیں لگا جیسے وہ لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہوں۔ خود اپنے حیرتوں سے چلتی ہوئی آئی ہوں۔

ٹوٹے پھوٹے راستوں پر دوڑتی ہوئی،
خارزار جھاڑیوں سے الجھتی ہوئی۔

ایک ایک انگ شدت سے دکھ رہا تھا۔ مگر اس کی اذیت صرف ان کا دل محسوس کر رہا تھا۔ تکلیف کا احساس جسم پر نہیں روح پر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تو دہرے صدمے سے گزر رہی تھیں۔ ایک اپنی شکست کا زخم۔ اپنی سبکی کا احساس ان سوراخ رہا تھا دوسرا بیٹی کے خوابوں کے بکھرنے کا۔ اس کی خوشی کا بننا گھر وندہ یک دم ٹوٹنے کا طلال۔ مگر یہ طلال انہیں کیوں کر ہوا۔ وہ حیران ہو گئیں۔ انہیں تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ وہ کاٹنا خود ہی نکل گیا تھا درمیان سے۔

عمر نے خود ہی اس کا رشتہ مسترد کر دیا تھا۔

تیوہر کی بات رد کر دی تھی۔ فہد کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا اور یہی تو وہ چاہتی تھیں۔ اسی تک وہ دو میں تو تھیں۔

مگر اب ایسی چوٹ کیوں گئی تھی کہ تکلیف کا احساس خون بن کر رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

ہاں مگر شاید اس طرح نہیں چاہا تھا۔

یوں تذلیل کے احساس کے ساتھ۔

وہ چپکے چپکے سارے آنسو بہا کر بیٹی کے پاس چلی آئیں۔

وہ جانتی تھیں اس کے کان کوئی خوش خبری سننے کے منتظر ہوں گے۔ مگر اب جبہ

کران کے پاس ایسی کوئی خوش خبری نہ تھی کہ وہ اسے اور کیسے بہلا دے سکتی تھیں۔

انہوں نے عمر کی طرف سے کیا ہوا انکار اس کے گوش گزار کر دیا۔ یہ سن کر وہ کہتے

کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس بات کو جھوٹ یا مذاق پر ہرگز معمول

نہیں کر سکتی تھی۔

عمر نے خود انکار کر دیا اس سے شادی سے۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں پھر سکڑنے لگیں۔ اسے اپنے اعصاب اکڑتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ دوسرے پل وہ تیرا کر قالین پر ڈھیر ہو گئی۔

شمرہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ لپک کر اس کے نزدیک آئیں اور اسے بازوؤں میں بھر کر اس کے منہ پر ہلکے ہلکے تھپتھپارے لگیں۔ ساتھ ساتھ ملازمہ کو بھی آواز دیں دیئے لگیں۔

”زبیدہ.... زبیدہ۔“

زبیدہ جلدی سے احمر کو بلاؤ۔ ان کے پاپا کو بلاؤ۔ جانے میری بیٹی کو کیا ہو گیا۔“ وہ کمرے میں داخل ہوتی ملازمہ کو دیکھ کر تجلیں تو وہ بدحواس اٹنے پیروں واپس مڑ کر شمرہ کے بیذروم کی طرف بھاگ لی۔

پاپا (احمر) خود گھبرا گئے اور ڈاکٹر کو لینے دوڑ پڑے۔ چند گھنٹوں بعد اسے ہوش آ گیا تھا۔ اور ہوش میں آنے کے بعد وہ ہلک ہلک کر رو رہی تھیں۔ شمرہ سے سنہیل نہ رہی تھیں۔ پاپا ڈاکٹر کو چھوڑنے باہر تک گئے تھے۔

”یہ جھوٹ ہے امی۔ کہہ دیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ آپ سب لوگوں کے منہ پر لکھ کر۔ ورنہ عمر ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ... وہ مجھے کبھی رشتہ نہیں کر ہی نہیں سکتے۔“

”بھول جاؤ اسے۔ وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے وہ دھوکے باز جھوٹا مکار۔“ شمرہ اسے تھپتھپتے ہوئے نفرت سے بولیں اس نے بھیگی بھیگی آنکھیں زور سے میچ لیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

رہتا تھا۔

اور اس کی ڈائری میں لکھیں وہ خوب صورت چھوٹی چھوٹی نظمیں۔ اور پھر اسے پڑھنے دینا۔ کیا یہ سب اس کے جذباتوں کی پذیرائی نہیں تھی؟

یہ ڈھکا چھپا اظہار نہیں تو اور کیا تھا۔

وہ کیسے یقین کر لیں کہ وہ ساری کی ساری محض اس کی غلط فہمیاں تھیں۔

اس نے بڑی بے بسی اور اضطراب سے نیچے پر سر ہنچا۔

ابھی تو رات بدلتی تھی ابھی تو پھول کھلے تھے

ابھی تو رات ڈھلتی تھی ابھی تو دغ سنے تھے

ابھی تو سرزمین جاں پر ایک بادل کو گھر کر آنا تھا

ابھی تو وصل کی بارش میں نیچے پاؤں پھرنا تھا

ابھی تو کشت غم میں اک خوشی کا خواب بونا تھا

ابھی تو سیکڑوں سوچی ہوئی باتوں کو ہونا تھا

ابھی تو ساحلوں پہ منکب ابرار بدلتی تھی

نہ جانے رات کے کس پہر اسے نیند آگئی تھی۔ صبح آکھ کھلی تو پورا بدن آگ کی طرح پھٹک رہا تھا مگر باوجود اس کے ایک ہی ضد تھی وہ نانو کے پاس جانا چاہتی تھی۔

شرہ نے اس کی ضد اور کیفیت کے بیش نظریاں جان کوفون کر دیا تھا۔ ان کا تو خیال تھا کہ وہ یہ معاملہ خود ہی مینڈل کر لیں مگر اب نہیں جی کی گزرتی حالت نے خوف زدہ سا کر دیا تھا۔

اماں تو فون پر عینہ کی بیماری کا سنتے ہی دوزی چلی آئیں اور جو اس کی حالت دیکھی تو ان کا کلیجہ مند کو آگیا انہوں نے لپک کر اسے ہانپوں میں بھر لیا۔ وہ بھی سارے

”نہیں امی۔ وہ دھوکے باز نہیں ہیں وہ جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ میں خود جاؤں گی وہاں۔“ آنکھیں کھول کر وہ اپنے جسم پر پڑی چادر دور پھینک کر شرہ کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے لے جائیں وہاں۔ میں نانو کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ پلیز امی! مجھے نانو کے پاس لے جائیں پلیز۔ لے جائیں نا۔“

”ہوش کرو عینہ۔ اتنی رات گئے وہاں کیسے جا سکتے ہیں۔ صبح نانو خود آئیں گی تمہارے پاس۔ میں خود انہیں لے کر آؤں گی بس! اب خود کو سنبھالو دیکھو تمہارے پاؤں پر پاپا بہت پریشان ہیں تمہارے لئے۔ تمہیں روتا دیکھیں گے تو ان کا دل بہت دکھے گا۔ بس کرو میری جان بس کرو۔“

وہ اس کا آنسوؤں سے بھیجا ہوا چہرہ پوچھنے لگیں۔ اس نے تھک کر نیچے پر واپس سر رکھ دیا اور رد سے پھٹتے سر کو سنبھال دینے کے لئے آنکھیں موند لیں۔

مگر اب بھی اس کی آنکھوں سے لاوا چپکے چپکے بہتا رہا جیسے دل کے اندر کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ وہ کیسے اس بات کا یقین کر لیتی کہ عمر نے اسے رد کر دیا ہے۔ کیا وہ اس کے جذباتوں سے نا آشنا تھا؟ مگر یہ کیسے ممکن تھا وہ تو خود اس کے جذباتوں کے چراغوں میں وقفے وقفے سے اپنے التفات کا تیل ڈالتا رہا تھا۔ وہ اس کی دیوانگی سے اچھی طرح باخبر تھا۔

اور پھر اس کی وہ دل آویز باتیں

وہ دل موہ لینے والی لگائیں

وہ دھیمبا جیسے لہجہ

اور روح میں اتر جانے والے جملے۔ جس کی پھوار میں گاہے بگاہے اسے بھگوتا

حوصلے ایک بار پھر بارگئی۔ نانو کے ہمدرد اور غم گسار بازوؤں میں بکھر بکھری گئی اور اتنا روئی، اتنا روئی کہ جیسے اب عمر بھر نہ رو سکے گی۔

نانو اسے تھک تھک کر سلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ دل دہلی زبان میں شرہ کو بھی برا کہنے لگیں۔ اسے مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔ شرہ پر ملال انداز میں ہونٹ جھینپنے اس کے سر پر خنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی جاری تھیں۔

”یہ سب تمہاری ضد کا نتیجہ ہے۔ صرف تمہاری بے جا ضد کا۔“ اماں کے اس الزام پر اس کا ضبط جواب دے گیا۔

”میری ضد؟“ انہوں نے انتہائی شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا پھر نفرت سے بولیں۔ ”میری ضد یا عمر نے اپنی برسوں پرانی دشمنی نکالی ہے۔“

”خبردار۔ جو عمر کو کچھ کہا یا اس پر کوئی الزام رکھا۔“ اماں آتشیں ہو کر پھٹ پڑیں۔

”اس بچے پر الزام لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے کون سا اس سے محبت، شفقت کا سلوک روا رکھا ہے۔ اپنی غلطیوں پر پردہ مت ڈالو شرہ۔ اس کے ساتھ تم نے اور شن نے آج تک جو کچھ کیا ہے اگر وہ بدلے میں ایسا کرے تو بھی اس کا حق بنتا ہے مگر وہ اس معاملے سے قطعی لائق ہے اس نے یہ کسی انتقامی کارروائی کے تحت نہیں کیا، وہ تو یوں بھی کسی سے بھی شادی کے حق میں نہیں تھا۔“

”جھوٹ بولتا ہے وہ۔ اس نے میری بچی کو دوغلا یا ہے۔“ شرہ یک دم چلائی اور ٹھنڈے پانی کا ڈونگا ہاتھ مار کر بینڈ سے نیچے گرا دیا اور خود بینڈ سے اتر کر کرسی پر جا کر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔

کمرے میں یلکھت ملول فضا چھا گئی۔ اماں جان کے ساتھ عینیہ بھی انہیں بس دیکھتی رہ گئی۔ کچھ دیر ان کی سسکیاں گونجتی رہیں پھر وہ دیر سے سے بولیں۔

”اس نے انتقام ہی لیا ہے مجھ سے۔ ہاں اماں اس نے انتقام لیا ہے۔“ وہ بے بسی سے ہونٹ کانٹنے لگیں۔

”اسے انتقام لینا ہوتا تو بہت پہلے لے چکا ہوتا۔ وہ کیوں تمہارا اور شن کا احترام کرتا رہا۔ محض مروت میں۔ اس کی رگوں میں شن کا نہیں شہلا کا خون دوڑ رہا ہے اس لئے اس کے اندر مروت ہے۔“

اماں جان نے اس کی طرف سے رخ موز لیا۔ ان کا لہجہ اس قدر کڑوا تھا کہ شرہ کٹ کر رہ گئی۔ پھر جھٹکنے سے کرسی سے اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ادھر عینیہ اس انکشاف کے متعجب رہ گئی تھی کہ عمر شن کا نہیں کسی شہلا کا بیٹا ہے۔ اس نے شرہ کو کمرے سے جاتے دیکھا پھر اسی حیرت آمیز نظروں سے نانو کا چہرہ تنکے لگی، جن کی نظریں اس کی جانب اٹھیں تو اس میں چھلنے سوالات نے انہیں غلط بھر کو نظریں چرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ نگاہیں جھٹکا گئیں اور اس کا سر ہو لے ہو لے دبا نے لگیں۔ مگر اس نے ان کا وہ لرزتا ہاتھ اپنی پیشانی سے بنا کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ان پر کٹر وری گرفت کرتے ہوئے لرزتی مرقش آواز میں بولی۔

”نانو! یہ شہلا کون ہیں؟“ اس کے ایک سوال میں ہزار سوال چل رہے تھے۔ ایک خوف زدہ کڑک رہا تھا۔ تجریم لکھو لے لے رہا تھا۔

”عمر کی ماں۔“ اماں جان کی آواز بے حد دھیمی تھیں۔ ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے ہیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی۔

ان میں عینیہ کے چہرے پر رنگ ہیں ڈالنے کا یارا نہیں تھا۔ وہ بس اس کی آواز سن رہی تھیں وہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے وہ سب بتا دیں نانو۔ جو آج تک مجھ سے چھپا پائے۔ امی کی عمر سے

نفرت کی کیا وجہ ہے؟ جس کی پلیٹ میں میرے سارے خواب آ کر کھرنے لگے ہیں۔ بتائیں
نانا نو۔ آپ کو میری قسم۔ عمر کی قسم۔ ”وہ ان کا ہاتھ جھنجھوڑنے لگی۔

اس کے لہجے میں منت، ساجت تھی۔ اماں جان نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے
نکال کر اس کے سر پر نرمی سے رکھ دیا۔

”جب ہماری سوچ کے برخلاف کچھ ہو جاتا ہے۔ جب ہم کسی سے خود بخود برت
سی تو قہات وابستہ کر لیتے ہیں اور جب وہ فوجی ہیں تو سوچ کا دھارا جذبات میں انہیں
رخ کی طرف بہنے لگتا ہے۔ دل میں کھچاؤ سا پیدا ہوتا ہے اور اس کھچے اور دل گرفتہ۔ مین میں
جانے جیسے نفرت کا بیج پڑ جاتا ہے اگر اس بیج سے اگنے والے پودے کو اگتے ہی نکالت دیا
جائے تو وہ تناور درخت بن جاتا ہے اور اگر اس کی مسلسل آبیاری کی جائے تو پھر وہ اس قدر
گھنا دیز ہو جاتا ہے کہ اس کی شاخیں ادھر ادھر پھیل کر محبت کے پودے کے اگنے کے لئے
جگہ نہیں رہنے دیتیں۔ اس کی جڑیں دل کی زمین پر دو در دو تک پھیل کر ساری زمین کو خرب کر
دیتی ہیں۔ بس پھر اس زمین پر نفرت کی خود رو جھاڑیاں ہی اگ سکتی ہیں اور نفرت کا جنگل
وجود میں آ جاتا ہے جو اس زمین کے سینے کے ساتھ ارد گرد کی زمینوں کو بھی خرابی ہی کر سکتا
ہے انہیں ٹھنڈا سا یا نہیں دے سکتا۔ انہیں صرف اندھیرا دے سکتا ہے۔ پھول اور خوشبو
نہیں۔ ایسا ہی ایک جنگل شرہ اور خن کے وجود میں آگ آیا ہے۔“

اماں جان کی آواز میں آنسوؤں کی نکل گئی اور باہر راہداری میں بے قراری
سے غمگین شرہ کے وجود میں یہی آگ کی بوندوں کی طرح خیب ٹپ کرنے لگی۔

وہ ایک کرب سمیٹ کر لاؤنج کے صوفے پر جا کر گرری گئیں۔ اس کی نرم پشت پر
سر رکھ کر سلگتی آنکھوں کو زور سے چچ لیا۔

وہ کچھ نہیں سننا چاہتی تھیں۔

کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھیں۔
مگر

سو جیس خود رو پودوں کی طرح اطراف میں اگتی جا رہی تھیں۔
نگاہوں تلے وہ سب لہرا رہا تھا جو ماضی بن چکا تھا۔

”ہاں اماں جان۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں میرے اندر نفرت کا ایک جنگل اگ گیا
ہے۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ سوائے اندھیرے اور بد بو کے اس جنگل میں کچھ نہیں
ہے۔

اسہوں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔



”دشمن، جنہیں تیمور بھائی سے کتنی محبت ہے؟“ شرہ نے کیسٹ پلیئر پر جھکی ٹمن
سے یہ سوال بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ جس کے جواب میں ٹمن نے یونہی کہنی کے بل لیے
لیئے صرف چہرہ مڑ کر اسے دیکھا پھر کیسٹ پلیئر میں ڈال کر کھٹ سے پلے کا ٹمن پیش
کر کے ہولے سے مسکرائی۔

”یہ اتنا بے ہودہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تمہیں؟“

”بے ہودہ تو نہیں ہے۔ کیا تمہیں محبت نہیں ہے تیمور بھائی سے؟“ وہ اب بھی
تکیہ گود میں دبائے اس سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ٹمن پشت پر ادھر ادھر بکھر جانے والے بالوں کو سمیٹ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”سوال تو بے ہودہ نہیں ہے مگر جواب بے ہودہ ہو سکتا ہے۔ یعنی وہی فلمی سا۔“

اس کے انداز میں شوٹی تھی شرہ ہنس پڑی۔

”چلو فلمی ہی سہی۔“

کیا مصیبت ہے۔ بھی تمہیں مجھے بٹھائے کیا دورہ پڑ گیا ہے کیا تمہیں پتا نہیں ہے کہ.....“ اس نے لب دانتوں میں دبالیے۔ ایک شرنگیں مسکراہٹ لبوں کو چھو گئی پھر اس نے نکلیہ اٹھا کر شرہ کو دے مارا۔

”بدتمیز لڑکی۔ بھلا میری محبت۔ میری بے تائیاں ڈھکی چھپی ہیں تم سے۔ ایک تم ہی تو ہو جو میرے اس پاگل پن سے واقف ہو۔“

تو محترمہ صرف میرے واقف ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ ایسے بھی واقف ہونا چاہئے۔“ شرہ زور سے ہنسی تھی وہ جھینپ نہئی۔

”بہتے ہیں وہ۔ سب واقف ہیں۔ کیا سمجھتے نہیں ہیں کہ میں ممانی جان سے نہیں صرف ان سے ملنے آتی ہوں اور تم بھی تو بہرہ وقت کو اس کرتی رہتی ہو۔ کیا وہ نا سمجھ ہیں۔ کم سن ہیں کہ نہ سمجھتے ہوں۔“

اور شرہ بہت کچھ کہنے کی خواہش اندر ہی دبا کر چپ سی ہو گئی۔

یہ سچ تھا کہ شن کی یہ وارفتگیاں محبت کی دیوانگیاں اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ وہ اس کی بھولی زادت ہی نہیں اس کی بہترین سہیلی بھی تھی۔

اسے خود بھی شن بے حد پسند تھی۔ اور اماں بھی شن کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ بس انتظار تھا کہ شرہ اور شن کا فاضل مکمل ہو جائے اور ادھر تیرہ بھوری تو ابھی مال مول کر رہا تھا۔ صبح کا ٹکڑا شام کو آتا۔ دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھتا اور جو شاہی کا موضوع نکلتا تو بڑی خوب صورتی سے وامن بچا کر نکل جاتا۔ سو اماں یہ موضوع چھیڑ نہئی تھی۔

مگر آج کل شرہ کچھ پریشان ہی تھیں۔ اسے تیور میں کچھ تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ اس پرے تو پہلے بھی کرتا تھا مگر اب تو لگتا وہ خوشبوؤں میں نہا کر گھر سے نکلتا تھا۔ کپڑوں پر بھی خصوصی توجہ دینے لگا تھا۔ رات دیر دیر تک جانے سے فون پر لمبی لمبی

گفتگو ہوتی۔ ہنسی مذاق۔ ہلکی بھلکی شاعری۔

وہ شن کو بھی خبردار کرنا چاہتی تھی مگر وہ تو شاید اپنے آپ میں ہی لگن تھی۔ اور خود پسندی میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ بھلا اس جیسی حسین پری کو چھوڑ کر تیور کسی اور میں دلچسپی کیسے لے گا۔

وہ اکثر کہتی۔

”تمہارا بھائی بہت مزہ ہے۔“

”بھی تم پوری جا دو گرنی ہو جو۔ ڈرتے ہیں نا‘ نگاہ دالی تم پر تو سرخ زدہ ہو جائیں گے‘ پھر کس کام کاج کے نہیں رہیں گے۔ یہ جو اتنی لمبی زلفیں ہیں نا۔ یہ آنکھیں کی طرح انہیں جکڑ لیں گی۔ اور یہ جو تمہاری جمیل آنکھیں ہیں نا ان میں ڈوب گئے تو پھر بچ نہیں سکیں گے۔ تیرا نا جو نہیں آتا۔ اور یہ جوب لب لعلیں ہیں نا تمہارے۔“

”اچھا۔ بس..... بس۔“ وہ اس سناٹس کو قفاخر سے سمیٹے ہوئے بیٹے شرہ کو دو

تین ہاتھ جڑ دیتی۔

”انہوں نے اپنی زبان تمہیں دے دی ہے کیا وہ آنکھیں پھیلا کر کہتی تو شرہ کندھے اچکا کاتی۔

”آف کورس۔ یہی سمجھ لو ڈیر کرن۔ تمہیں پتا نہیں ہے یہ مڑے قسم کے اور نگاہوں کو بچا بچا کر چلنے والے ہوتے ہیں نا وہی ایک کے ہو کر رہتے ہیں اور ان کی محبت بھی گہرے سمندر جیسی ہوتی ہے۔ ایک بار اپنے اندر ڈوبنے والے کو ابھر نے نہیں دیتے۔“

”اے ہوئے۔ بڑی دکالت کر رہی ہو بھائی کی مگر شرہ ڈیر

یہ تو فائدہ ہے نا۔ تم تو میری راز داں‘ میری سہیلی ہو۔“

”بھی تم کو تو تمہارے دل کا حال بھی من و عن ان تک پہنچا دوں۔“ اور جوب

شمن ایک گہری سانس بھر کر رہ جاتی۔

حال دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پر
ہاں مگر اس شہر میں اک بے خبر بھی دیکھنا

اور اب شمرہ سوچ رہی تھی کہ وہ شمن کو کہہ دے گی کہ حال دل سننا ہے نہ دینا
کرے۔ کہیں اس کا بھائی واقعی کسی اور کی زلفوں کا..... نہیں نہیں خدائے کرے۔
وہ تو تصور میں بھی شمن کے علاوہ کسی اور کو بھائی کے روپ میں برداشت نہیں کر
سکتی تھی۔

اس روز اس نے فون کر کے شمن کو صبح سے بلوایا تھا۔ چونکہ سڑے تھا۔ کالج بھی
آف تھا اور گھر میں بھی خرافت تھی۔ سو وہ چلی آئی پھر اسے پکن میں مصروف دیکھ کر بولی۔
”یہ سب کس سلسلے کی تیاری ہے۔ کوئی آ رہا ہے کیا؟“ اس نے پیزا کے لئے
شمرہ کو میدے سے اچھٹے پا کر پوچھا سلیپ پر بھی ارد گرد دیکھ بنانے کے لوازمات بکھرے
پڑے تھے۔ ایک طرف پکن رول کے لئے پکن رکھی تھی۔ ٹوٹے ہوئے انڈے ایک
چیلے میں پڑھے تھے وہ حیرت اور تجسس سے یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

”اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ سب دیکھنے کی بجائے ہاتھ جیر چلاؤ۔ تم نے مونا
کے یہاں ایک اس روز بڑا زبردست بنایا تھا۔ آج ذرا بناؤ تو۔“
”مگر یہ سب کس کیلئے کر رہی ہو؟ اتنا ٹھونسو گی خود کیا۔“ اس نے دونوں ایک طرف
لٹکایا۔ آستین فولڈ کی اور انڈوں کو پھینٹتے ہوئے بولی۔

”ہاں اتنی ہی پیڑھوں ہوں۔ اب کبھی ٹھونسنا ہے اکیلا اتنا۔ وہ میدے میں حیر ملا کر اسے
ایک ادنی کپڑے سے ڈھک کر بجھے اوون کے اندر رکھ کر ہاتھ بیسن میں دھونے لگی۔
”بھئی مجھے کیا پتا میں روز تمہاری جاسوسی تموز اسی کرتی ہوں۔“

”اچھا حکومت۔ اور سنو ایک مزے دار ہونا چاہیے اور آئنگ بھی کرنا اور اس پر
لکھنا Happy Birthday شمرہ اس کا کندھا تھپک کر پکن کے دروازے کی طرف بڑھ
گئی۔ اس نے سر ہلادیا پھر یک دم چونکی اور میدہ چھاتے ہوئے چلائی۔

”اے اے“ کیا مطلب ہے برتھ ڈے۔ مگر ابھی دو ماہ پہلے ہی تو تمہاری برتھ ڈے
آئی تھی۔ کیا پھر؟ شمرہ بے وقوف لڑکی لڑکیاں تو تین سالوں بعد اپنی ایک سالگرہ مناتی
ہیں اور تم ہر دو مہینے کے بعد۔“

اف کس قدر احمق لڑکی ہو تم۔“ شمرہ پلٹ کر اسے گھورنے لگی۔ ”کیا اس پورے
گھر میں بلکہ اس دنیا میں ایک واحد میری ہی سالگرہ ہو سکتی ہے۔ گدھی لڑکی۔ تیمور بھائی بھی
برساں بڑھتے ہیں۔“

”ایں۔ اس کا ہاتھ میدے کی تھیلی میں چھپ سے پڑا تو چونکی۔ پھر بیٹی کے انداز
میں اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ایک خوب صورت رنگ اس کے چہرے پر آ کر ظہور کیا۔
”تو یہ کونسا۔ بے ہودہ لڑکی۔ اب دیکھنا کیسے کیا بنا ہے بلکہ تم کہو تو بیڑا بھی میں
ہی بنا دوں۔“

شمرہ زور سے ہنسی۔
”اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ بعد شوق۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ مرد کے
دل کا راستہ معدے سے ہو کر گذرتا ہے۔ تم معدے کا سب سے پہلے نشانہ لو۔ نشانہ ٹھیک لگا
تو سمجھو دل بھی تمہارا۔“

”ارے جاؤ۔ دو تو ہمارا ہی ہے۔ معدے کا راستہ وہ چنتی ہیں جن بے چار یوں
کے پاس دل چننے کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہوتا۔ نہ شکل نہ عقل۔“ اور جابا شمرہ تہقہ مار کر
نفس پکڑا۔ بات تو سو فیصد درست تھی۔

نازک سراپا۔

گوری جی رنکت۔

گھٹاؤں جیسے بال۔

وہ مکمل تھی اور اس پر ادائیں دل مولینے والیں۔

شام کے وقت دونوں نے نل کر لان کی کین کی ٹیبل لوازمات سے سجادی۔ اب تیور کے کمرے سے نکلنے کا انتظار ہونے لگا۔ وہ عموماً شام کی چائے اہل خانہ کے ساتھ لان میں ہی پیتا تھا۔ اسی لئے وہ حسب عادت لان میں آیا تھا مگر بیٹھے نہیں بلکہ اماں جان کو خدا حافظ کہنے۔

وہ پریس شدہ کپڑوں میں تازہ تازہ شیو کیے خوشبو میں بسا۔ ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے ادھر آیا اور ٹخن کو گویا اپنا دل پہلو سے ٹکاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ٹخن کو دیکھ کر اخلا قاس سے سلام دعا کرنے لگا۔

”کیسی ہو ٹخن؟“

”شکر ہے آپ کو نظر تو آئی میں۔“ وہ جواباً شرارت سے ہنسی۔ وہ نخل سا ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کس بات کا؟“ اب بھی شرارت آمیز انداز تھا۔

”آپ بیٹھے تو سہی۔“ ٹمرہ اسے کھڑا دیکھ کر بولی۔

”نہیں بیٹھے ویسٹ ہسے کا تو تو قائم نہیں ہے؟“ اُمی کہاں ہیں؟“ اس نے ریست واضح یہ نگاہ ڈالی۔ لوازمات سے جی میز پر اس کی نگاہیں نہ گئی تھیں۔

ٹمرہ اور ٹخن نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ٹمرہ بولی بلکہ چلائی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ جا رہے ہیں اور یہ جو بہت سامہم نے تیار کیا

ہے۔ کیوں؟ چتا ہے کچھ۔“

وہ اب کے چونکا۔ پہلے ٹیبل کو پھر ٹمرہ کو دیکھنے لگا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”آج آپ کی برتھ ڈے ہے۔ اور ہم نے بلکہ ٹخن نے آپ کو سر پرانز دیا ہے۔“

اسی نے ٹیک بیک کیا ہے اور بیڑا بھی بنایا ہے۔

”اوہ۔“ اس نے ہونٹ بے ساختہ بھینچ کر ٹخن پر نگاہ ڈالی۔ خاصی شرمندہ سی معذرت خواہانہ سی نگاہ تھی۔

”تم لوگوں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ اب تو میرا جانا بہت ضروری ہے۔ ایک دوست کو ٹائم دیا ہوا ہے۔“ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خاصا متاسف نظر آ رہا تھا۔

”کیا وہ دوست مجھ سے بھی اہم ہے؟“ ٹخن نے سر اٹھا کر اسے بول دیکھا جیسے اسے چنانا کر دے گی اس کے قدموں کو جکڑ لے گی۔ پھر کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ خوب صورت لباس اور ہلکے ہلکے میک اپ میں وہ بھرپور اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر بلاشبہ حسین لگ رہی تھیں۔ بالوں کو اس نے پشت پر کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ جو کسی آبشار کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

تیوران کے انداز پر ذرا سا چونکا۔ پھر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے چابی پھیلی پر اچھالتے ہوئے بولا۔

”بات اہم یا غیر اہم ہونے کی نہیں ہے بات زبان کی بنے کیے ہوئے وعدے کی ہے اور میں وعدہ خلاف بہر حال نہیں ہوں۔ آئی ایم سوری ٹخن۔ میں ٹمبر نہیں سکتا میرا خیال ہے میری واپسی کا تم لوگ انتظار کرلو۔ رات تو ہماری ہی ہوگی نا۔ ہلہ گلہ کر لیں گے۔“ وہ آخر میں کچھ سوچ کر پچکارنے والے انداز میں بولا تھا پھر ان دونوں کے جواب کا انتظار

کے بغیر بولا۔

”اچھا اذکے۔ میں امی کو خدا حافظ کہہ آؤں۔ پلیز گرلز! مائنڈ مت کیجئے گا۔ آپ لوگوں کی محبت اور خلوص سر آنکھوں پر۔“ وہ ہنسا پھر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد بڑی تیزی سے باہر آیا اور روتی پر چلتا ہوا پوریکلو میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر یہ جاوہ جا۔
خمن اپنی جگہ ابھی تک پتھر کے مجھے کی طرح کھڑی تھی۔ شرہ الگ شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی رہی۔ پھر سانس بھر کر بولی۔

”کیا خیال ہے انتظار نہ کر لیں ان کا؟“

خمن چپ چاپ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اسے بڑا دھچکا لگا تھا۔ تیور کے رویے سے۔ اسے ہیز اور ایک پر محنت کرنے کا دکھ نہیں تھا بلکہ اپنے اوپر کی گئی محنت کا دکھ تھا جو ضائع گئی تھی۔ اتنا حسین مرد پہلو میں دل رکھتے ہوئے بھی حسن کی تپش محسوس نہ کر سکتا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

یا تو یہ شخص پاگل ہے یا پھر.....

یا پھر۔“ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

یا پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”دراصل تیور بھائی۔ اپنے وعدے کے بہت کچے ہیں۔ اب کسی دوست کو نا تم دے دیا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے دوستوں نے ان کی تھوڑے کو سلیمہ یت کیا ہو۔“
”جو بھی ہو۔ لکھ لو کہ تمہارا بھائی انتہائی سڑو ہے۔“ وہ شرہ کا ہاتھ کندھے سے جھٹک کر بیڈ پر جا کر بیٹھی اور منہ بھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ شرہ ہنسنے لگی۔

”سارے بدلے گن گن کر لے لینا ایک بار ہی۔ تم کہو تو امی کو بھیجوں اب۔“ وہ اس کی طرف جھکی تو وہ چہرہ موڑ کر اسے آنکھیں دکھانے لگی۔ تب شرہ مزید شرارت سے بیڈ

کے سائڈ بورڈ پر انگلیاں بجا کر گانے لگی۔

آئے گا کوئی آئے گا
دھڑکن دھڑکن پھول کھلیں گے
جھوم انھیں گے سارے نظارے
دلہن بن جائیں گی راہیں
دیکھ کے اسکو پھیلاؤں گی

”شرہ کی پکی۔“ اس نے نکلیہ اٹھا کر اسے دے مارا مگر شرہ خوشی اور شرارت سے ای ٹوئن میں گاتی رہیں۔

بھتا اس نے ترپا پا ہے
میں بھی اسے ترپاؤں گی
اک ادا سے ہاتھ چھڑا کر آج خفا ہو جاؤں گی
اپنی نظر میں پیار سجا کے
مجھ کو یار منائے گا
آئے گا کوئی آئے گا
دھڑکن دھڑکن پھول کھلیں گے

اس کی شرارتیں عروج پر تھیں۔ خمن اسے دوسرا تکیہ مار کر ہنستی ہوئی بیڈ سے اتر گئی۔ اور شرہ چیختی رہ گئی گروہ کمرے سے بھاگ نکلی۔



کئی دنوں سے دل کی دیواروں پر آہٹ دیتا حد شرہ کے دل کے دروازے پر آخر کار دستک دینے چلا آیا۔ تیور میں ہونے والی تبدیلیوں کا محرک منظر عام پر آ گیا تھا۔ وہ

اماں سے کسی شہلانا می لڑکی کیلئے غائب کر رہا تھا۔

”اور شمن۔ شمن کا کیا ہو گا؟“ اماں کی آواز میں دل گرفتگی تھی۔ اور وہ تیسور کے کمرے کے باہر دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی تھی۔

نہ وہاں سے ہٹنے کی سکت تھی نہ اندر جانے کا یارا۔

”شمن... کیا مطلب؟ شمن کون سی میرے نام پر بیٹھی ہے کہ اس کی فکر ہے آپ کو۔ یہ تو محض آپ کی خواہش تھی۔ صرف آپ کی۔ میں نے کبھی آپ سے شمن کا نام نہیں لیا۔ اسی پلیر۔“

وہ اماں جان کے قریب فرش پر دوڑا نو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے لہجے میں بھی نہیں اس کی آنکھوں میں بھی منت سماجت اتر آئی۔

”آپ ایک بار شہلا سے مل تو لیں۔ وہ آپ کو بے حد پسند آئے گی امی! ہم دونوں کے درمیان بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ اور ذہنی ہم آہنگی تو رشتوں کو مضبوط کرتی ہے نا۔“

”مگر..... مگر شمن میں کیا خرابی ہے۔ مگر لڑکی ہے۔ میرے بھائی کی بیٹی۔ اچھی شکل۔ پڑھی لکھی۔ اچھے خاندان کی۔ اسے رد کر کے تم ایک غیر لڑکی کو لانا چاہتے ہو اس گھر میں۔“

اماں بڑی بے بسی سے اسے دیکھنے لگیں۔

تیسور ان کا اکلوتا ڈالا بیٹا تھا۔ ان کا فرماں بردار ان کا چیتا۔ آج سے پہلے کبھی ان کے کسی حکم کی سرطانی نہ کی تھی۔ ان کی ہاں کو ہاں اور ان کی ناں کو ناں تسلیم کیا تھا۔ اس کی فرماں برداری پر تو انہیں فخر تھا اور آج پہلی بار وہ اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔ ان سے بھیک مانگنے کی طرح اپنا جائز حق مانگ رہا تھا ان کا دل بیچ رہا تھا۔ اگر شمن کا معاملہ نہ ہوتا تو

وہ جھٹ پٹ خوش خوشی اس کے ساتھ شہلا کے گھر دوڑ پڑتیں۔

”مگر اب شمن کا معاملہ تھا گو کہ انہوں نے کبھی بھائی بھادج سے اس خواہش کا اظہار تو نہ کیا تھا مگر دل ہی دل میں شمن کو بہو کا روپ دے بیٹھی تھیں۔

مگر اب تیسور نے ان کا قصور بکھیر دیا تھا۔ وہ ایک خواب جو مسلسل دیکھتی آ رہی تھیں ایک چھنا کے سے توڑ ڈالا تھا۔ انہوں نے بڑی رنجیدگی سے بیٹے کو دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”تم ایک بار پھر سوچ لو تیسور! شمن بہت اچھی لڑکی ہے تمہیں خوش رکھے گی۔“

”یقیناً امی! شمن بہت بلکہ لاکھوں میں ایک ہوگی۔ مگر یقین کریں میں نے اسے کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ہے اور اب جبکہ شہلا میرے دل میں ہے میں کیسے شمن کو دیکھ سکتا ہوں۔“ اس نے اپنی بات کے اختتام پر اماں کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر نرمی سے باتے ہوئے کہا۔

”میں گستاخ نہیں ہوں امی جان۔ آپ کا ہر فیصلہ سراسر آنکھوں پر۔ مگر میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں بٹ جاؤں گا دو خانوں میں، خود اپنی نظروں میں کر جاؤں گا، میرا وجود شمن کے پاس ہو گا مگر میرا دل، میری روح میرا ذہن شہلا کے پاس، میری نظریں شمن پر ہوں گی مگر میرے دھیان کے سب راستوں پر شہلا بیٹھی ہوگی۔ نہیں امی! اتنی مشکل، صبر آزما اذیت ناک زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ میں تنہا رہوں۔“ وہ اٹھنے لگا تھا کہ اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے سوچنے دو تیسور! تم نے برسوں میں کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں بھلا تمہیں کیسے مایوس کر سکتی ہوں۔ بس کچھ دن ٹھہر جاؤ۔“ انہوں نے یہ کہہ کر گہری سانس بھری پھر صوفے سے کھڑی ہو گئیں۔

سر بلا دیا۔

اس کا دل جا ہوا اماں کو پکڑ کر جھنجھوڑے اور کہے۔ ”خدا کے لئے امی! اٹھن پر یہ ظلم مت کریں۔ شہلا بالکل بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ثمن پر فروقت دی جائے۔ تیور بھائی کی تو آنکھوں پر پٹی چڑھ گئی ہے۔ جانے اس چڑیل نے کیا ستر پڑھ کر پھونکا ہے اس پر مگر وہ بے بسی سے خاموشی سے چائے لگ بھگ کر پکچن سے باہر نکل آئی۔ اس اجنبی، ان دیکھی لڑکی سے اسے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

شام کو وہ ثمن کے کمرے میں اس کے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی تھی اور ثمن کیسٹ پلیئر میں اپنی پسند کی کیسٹ رپوائنڈ کر رہی تھی جب اس نے اپنے بیگ سے وہ تصویر نکالی اور اس کے آگے ڈال دی۔

”تم اور میں یہی سمجھتے رہے آج تک کہ تیور بھائی بالکل بے حس ہیں ان کے اندر محبت کرنے اور محبت محسوس کرنے کی حس ہی نہیں ہے۔ مگر آج ان کی بے حس طبیعت سے لافغانی اور بے گانگی کا سبب بھی مل گیا ہے۔ یہ ہے وہ سبب“ وہ بے حس نہیں ہیں۔“
ثمن اچھل کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ ریشمی زلفیں ادھر ادھر کھٹکھٹیں اور سیاہ زلفوں کے ہالے میں اس کا چہرہ بالکل سادگی کی جھٹکے کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ بس وہ آنکھیں اٹھا کر شرم کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”یہ ہے وہ لڑکی جس سے وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر شرم نے نگاہیں جھکا لیں اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

ثمن نے لرزتی انگلیوں سے اپنے سامنے پڑی تصویر اٹھائی مگر جوں ہی تصویر پر نگاہ پڑی ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھڑ گئی۔ اس نے ثمن کو ابرو اچکا کر دیکھا پھر دوبارہ اس تصویر کو دیکھنے ہوئے استہرا سہرائی ہوئی۔

تیور کا چہرہ یوں دمک اٹھا جیسے کسی نے نیچے ہوئے دیئے میں ایک دم دھیر سا راتیل انڈیل دیا ہو جب کہ وہ رات شرمہ کے لئے بے حد بھاری تھی۔ اسے شدید قسم کا ذہنی دھچکا لگا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ثمن کے علاوہ اس کی بھابی بن کر کوئی اور لڑکی بھی آ سکتی ہے۔

”بھلا ایسا کیا ہے اس لڑکی میں جس کے لئے تیور نے ثمن جیسی حسین لڑکی کو رو کیا ہے۔“

ایک دم تجسس کی ایک لہر اندر سے اٹھی۔ اسے اس اجنبی لڑکی کو دیکھنے کی تمنا ہوئی۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ وہ ثمن کے مقابلے میں کم ہوگی۔ اور اسکا یہ یقین سو فیصد درست نکلا۔

تیور کے آفس جاتے ہی اس نے اس کے کمرے میں چھان پھنک کی تو اسے بریف کیس سے تصویر مل گئی۔ وہ تصویر دیکھ کر حیرت سے لنگ رہ گئی۔ اسے یقین تو تھا ہی کہ وہ ثمن سے کم شکل کی ہوگی مگر اس قدر عامی صورت ہونے کا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اماں کی آواز پر اس نے جلدی سے بریف کیس بند کیا اور تصویر لئے کمرے سے باہر نکل آئی اور تصویر اپنے کالج بیگ میں رکھ دی۔

”آج تم کالج نہیں گئیں۔“ وہ کچن میں آئی تو اماں بولیں۔

”نہیں سر کچھ بھاری بھاری ساہو باہے۔“

اس نے یہ کہہ کر جانے کی کشتی اٹھا کر چولہے پر رکھی۔ ”امی میں ماموں کی طرف جاؤں گی۔ ثمن نے بھی جھپٹی کی ہے۔ ہم دونوں مل کر اپنا جوتل پورا کر لیں گے۔“ وہ ان سے نظریں چرا کر کینٹ سے لگ نکلتے ہوئے بولی، اور ردیدہ نگاہوں سے اماں کو دیکھا جن کا تیزی سے حرکت کرتا ہاتھ زردار کو رکھا تھا۔ پھر انہوں نے دوبارہ پیاز کاٹنے ہوئے

”مجھے بے وقوف بنانے کیلئے کم از کم حسین نہ سہی کم حسین لڑکی کی ہی تصویر ڈھونڈ ڈھاؤں کر لے آئیں۔ کیا اس سے میں ڈر جاؤں گی۔ اونہہ شادی کر رہا ہے تیمور اس سے۔“ اس نے تصویر سے پر انگلیاں ماریں شرہ نے دل گر گئی سے اسے دیکھا۔

”یہ مذاق نہیں ہے شن۔“ اس نے کرب کی اٹھامیں ڈوب کر ہلکے سے چیخ کر کہا تھا۔ ”یہ حقیقت ہے میں نے یہ تصویر ان کے بریف کیس سے نکالی ہے۔ شہلا نام ہے اور.....“

”کم آن شرہ۔ اس..... اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تیمور۔ کیا پاگل ہوا ہے وہ۔“

”پاگل ہی تو ہو رہے ہیں۔“ شرہ کی سانس دھیرے سے خارج ہو گئی۔
شن کے چہرے پر لمحہ بھر کو تاریک سایا سا گزر گیا۔ شرہ کا لہجہ اس کے اعصاب کو مضطرب کرنے لگا۔

اس کی نظریں تصویر پر جم گئیں۔ پھر وہ یکا یک بے اختیار ہنس پڑی۔
”میں ہرگز یقین نہیں کر سکتی کہ تمہارے بھائی کا ٹائٹ اس قدر بوگس ہو سکتا ہے۔ نہیں میں نہیں مان سکتی اور اس..... اس شکل کو مجھ پر فوقیت دے گا کیا ہے اس میں؟ دیکھو..... دیکھو ذرا۔ ایسے ایسے چہرے بھی بھلا دلوں کو تغیر کر سکتے ہیں۔ کسی کو اپنا دیوانہ بنا سکتے ہیں۔ اوہ نو۔ ہاؤ فن۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسنے ہنسنے کا ایک اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ شرہ رنگ سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے دیکھا شن نے دراز کھولی اور سیاہ رنگ کا مارکر نکالا اور تصویر پر پھیرنے لگی۔

”کک..... کیا کر رہی ہو شن؟ یہ تصویر تو۔“
”کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ پہلے بھی ایسی ہی نظر آتی تھی اب بھی وہی رہے گی“

دیکھو۔“ اس نے تصویر اٹھا کر شرہ کے سامنے کر دی مونسے سیاہ اسپرٹ مارکر سے لکیریں تصویر کے چہرے پر ادھر ادھر کی کھینچی ہوئی تھیں۔

”بھلا یہ مارکر اس کا کیا لگاؤ سکتا ہے جب تقدیر اسے سنوار رہی ہے۔ ہاں تقدیر۔“ اس نے تصویر پھینکی اور پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

”شن۔“ شرہ اس سے لپٹ گئی۔ ”یوں مت رو شن۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں اور امی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔“

شرہ کا لہجہ بڑا کمزور سا تھا یوں جیسے سایا روشنی سے لرزتا ہوا محسوس ہو۔ چونکہ اسے اپنے الفاظ کی کم مانگی کا احساس تھا۔ اپنے کمزور ہونے کا احساس تھا۔ پھر وہ خود بھی رو پڑی۔



شن کی حالت اب شرہ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ممائی الگ پریشان تھیں۔ وہ شرہ سے پوچھتیں کہ یکا یک شن کو کیا ہو گیا ہے۔ اور شرہ انہیں بہانے سے ٹال دیتی۔

ادھر تیمور کے علم میں شن کی یہ شدتیں آئیں تو اسے اچھا خاصا غصہ آ گیا۔
”میں نے اس سے کسی قسم کے وعدے و وعید نہیں کیے ہیں نہ اس کی کبھی پذیرائی کی ہے۔ بلکہ میں تو اس سے باتیں بھی ایک فاصلے سے کرتا رہا ہوں۔ اب یہ اس کی خود ساختہ پریشانیاں ہیں۔ آپ ممائی جان سے کہئے کہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی کر دیں۔ وہ رفتہ رفتہ معمول پر آ جائے گی۔“

اس نے اماں جان کو مزید اس کی حمایت سے روکنے ہوئے ساتھ مشورے سے بھی نوازا دیا۔

اماں جان چپ ہی ہو کر رہ گئیں مگر شمرہ نے ہمت نہ ہاری اور ایک کوشش خود کرتے ہوئے رات اس کے پاس آئی اور اسے لگے تھکے تھکے سے باہری ہو گیا۔

”تم لوگ سمجھتے کیا ہو آخر؟ کیوں مجھے الزام دے رہے ہو۔ کب میں نے اسے آس دلائی تھی۔ اس سے عہد و پیمان باندھے تھے کب اسے کوئی اشارہ دیا تھا۔“ اس نے بری طرح غصے سے شرہ کو گھورا۔ وہ ہونٹ کانٹے ہوئے دل گرفتگی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ تیور نے خود کو کرسی پر گرالیا اور جیسے لمبے میں بولا۔

”دیکھو شرہ! شادی بیاہ کوئی جبر کا سودا نہیں ہے۔ میرے پاس اس کو دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اول تو میں قربانی دینے کا قائل نہیں ہوں بالفرض حال کر بھی لیا تو اسے کوئی خوش نہیں دے سکوں گا۔ بلکہ خود بھی بے سکون رہوں گا۔“

”مگر..... مگر وہ تو اتنی عامی لڑکی ہے آپ کو کیا نظر آیا ہے اس میں۔ شمن کے مقابلے میں تو وہ۔“ وہ دوسرا حربہ آزمانے لگی۔ وہ اس وقت شمن کی زبردست حمایتی دکھائی دے رہی تھی۔ تیور نے ابرو چاچکا کر اسے دیکھا پھر دیر سے مسکرانے لگا۔

”جانتا ہوں یہ تمہاری نہیں شمن کی زبان بول رہی ہے تمہارے منہ میں۔“ اس کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی۔ ”اے اپنے حسن اور ناز و ادا پر بڑا زعم رہا ہے۔ میں نادان یا کم سن نہیں ہوں۔ مرد ہوں شمرہ۔ عورت کی ہر نظر سمجھتا ہوں۔ اس کی وارفتگیوں“ اس کی نظر واد کے تیر۔“

وہ بے ساختہ ہنسنا تھا۔ شمرہ نے چہرہ جھکا لیا۔

”بہت سسطی سی لڑکی ہے شمن! اس میں اور شہلا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے گردن اٹھا کر شرہ کو دیکھا۔

”حسن کیا ہر مرد کی کمزوری ہوتا ہے۔ حسن وہی نہیں جو دکھائی دے۔ حسن وہ بھی

ہے جو محسوس ہو۔ اور میرے نزدیک محسوس کیا جانے والا حسن ہی پائیدار ہوتا ہے۔ اگر شکلوں، صورتوں سے تمجیسی کی جائیں تو دنیا کا ہر مرد مغرب کی طرف ہی دوڑتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ محبت تو جنت سے اتر ا ہوا جذبہ ہے۔ بہت اعلیٰ اور ارفع۔ یہ شکل، صورت، دولت، امارت بے بے نیاز ہے۔ جاؤ اور اسے سمجھاؤ کہ وہ یہ بچکانہ حرکتیں بند کر دے اور اپنی پڑھائی پر توجہ دے اور جہاں ممانی جان اس کا رشتہ کر دیں وہاں سر جھکا دے۔ عورت کا وقار فرماں برداری میں ہے نہ کہ باغیانہ پن میں۔“ اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ اور کرسی سے اٹھ کر دروازے سے نکلیں نکال کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ شرہ کو ہنوز اپنی جگہ کھڑے دیکھا تو بولا۔

”جاتے جاتے دروازہ ابھی طرح بند کر کے جانا۔“

شرہ نے بے چارگی سے بھائی کا چہرہ دیکھا اور ناچار پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس کی تاکید پر عمل کرتے ہوئے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا پھر بند دروازے پر ایک پر لال نگاہ ڈال کر وہاں سے ہٹ آئی۔



”شمن! تیور بھائی اپنے دل کا دروازہ بہت سختی سے بند کر چکے ہیں تمہارے لئے اس میں خفیف سی دراڑ بھی نہیں ہے۔“ وہ شمن سے کہہ رہی تھی۔ کہ اب اسے ہر طرح سے سمجھنا نا بھجنا ہی تھا۔ ”خود کو ہلکان مت کرو۔ بھول جاؤ انہیں۔ نکال دو انہیں دل سے کہ کبھی جیسے وہ تمہارے دل میں اترے ہی نہ تھے۔“

”شرہ! اگر شہلا تیور کی زندگی میں نہ آتی تو‘ میری ہی جگہ تھی نا۔“ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سگے سگے لمبے میں بولی۔ شرہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے اندر دو دھارے چلنے لگے تھے ایک دھارا اس نفرت کا تھا جو شہلا نا ہی لڑکی کے خلاف پیدا ہو چکا تھا اور دوسرا دھارا شمن سے محبت، دوستی کا تھا۔ اس کی تڑپ اسے تڑپا رہی تھی۔ اس کی نا

کہ وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ دلہن کی طرف جھکتے ہوئے اپنا گداز خوب صورت ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا رہے ہوئے بولی۔

”اچھا۔ اب انشاء اللہ دو دن بعد ملاقات ہوگی۔“ اس نے اپنا سجا سورا ہاتھ یوں پیش کیا جیسے کوئی خوب صورت چیز سراپنے کے لئے پیش کی جائے۔ بلاشبہ وہ ہاتھ نظر بھر کر دیکھنے کے قابل تھا مگر شہلا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ تمام کر پٹکے سے چھو کر چھوڑ دیا۔

شادی ویسے بعد کچھ دن تو تیور اور شہلا دعوتیں امینڈ کرتے رہے۔ پھر کہیں جا کر فراغت کے لئے میسر آئے تو ممانی جان دعوت دینے چلی آئیں مگر تیور نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ابھی تو فراغت ملی ہے۔ اب کاروبار بھی توجہ مانگتا ہے۔ کچھ مفتوں کے بعد ہم دونوں خود آجائیں گے۔“

تیور کے اس انکار پر اماں جان ذرا ساجیران ہوئیں تاہم بولیں کچھ نہیں۔ شمرہ کو بھی بڑا برا لگا تھا۔ خاندان بھری دعوتیں کھالیں۔ شمن کے گھر ہی کیوں انکار کر دیا۔ یقیناً بھابی ”شہلا“ نے بھی روکا ہوگا۔ رات شمن خود چلی آئی۔

”ہمارے گھر کا کھانا اتنا برا نہیں پکتا تیور صاحب کہ آپ یوں دامن بچا گئے۔ زہر تو نہیں کھلا دیتی میں۔“ وہ بظاہر ہنستے ہوئے بولی مگر اس کے لہجے میں آئی آج تیور کے ساتھ شہلا بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکی۔ مگر سر اٹھانے کی بجائے اماں کے تخت پر چڑھی اماں کے ساتھ کر دیشا کا دھاگا سلجھاتی رہی۔

تیور ریوٹ سے ٹی وی بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”کیا بھر دسنا تمہارا۔ زہر کھلا بھی دیتیں۔“ بظاہر اس نے بھی خوش دلی کے تاثر کے ساتھ ہی کہا تھا مگر جملہ اس کے دل پر لگا۔ وہ اٹھ گئی اور کچن کی طرف بڑھنے سے پہلے ذرا سارا رک کر بولی۔

”آج سے پہلے کبھی کھلایا ہے۔“

”آج سے پہلے کبھی یوں دعوت ہی نہیں دی بھدا اصرار۔“ وہ بھی اسے چھیڑنے

کی غرض سے بولا تھا۔ وہ کچھ برا ماننے ہوئے بولی۔

”یہ تو آپ کا خیال ہے دگر نہ ہمارے گھر کے دروازے تو بلکہ ہر طرح کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہی ہیں ہمیشہ سے۔ اب آپ ہی قدم نہ گھس یہ آپ کی مرضی۔“

تیور بری طرح شٹ گیا تھا اور یونہی بے اختیار شہلا کی طرف دیکھا مگر وہ بے حد پرسکون اور اپنے اسی اعتماد کے ساتھ بیٹھی مصروف رہی۔ جب کہ اماں جان اس کے جملے کے مفہوم اور لہجے کی آنچ سے بے نیاز بولیں۔

”نہ شمن، تم دل پر نہ لینا۔ میں نے شہلا کو بھی کہا ہے جوں ہی وہ ذرا فارغ ہوں گے تمہارے گھر آئیں گے۔ بس کئی دنوں سے لگا تار کاروبار کی طرف توجہ بھی نہیں دے سکا ہے نا۔ اسی وجہ سے انکار کر رہا ہے۔“ انہوں نے جیسے تیور کی طرف سے اس کا دل صاف کرنا چاہا مگر جیو تو رکی طرف سے گدلا ہوا تھا وہ بھلا اماں جان کی کوششوں سے کیسے صاف ہو سکتا تھا۔ وہ بس ایک استہزا آمیز مسکراہٹ اچھال کر شمرہ کے پاس کچن میں چلی آئی۔

شمرہ سلا دینا رہی تھی رات کے کھانے کے لئے وہ کھیرے کا ایک کٹورا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے ناگوار رہی بولی۔

”یہ سارا سارا دن تم کام میں مصروف رہتی ہو۔ وہ مہارانی کس مرض کی دوا ہے؟“

”وہ مہارانی جانی کی ہی نہیں امی کی بھی منظور نظر بن کر رہ گئی ہے۔ سو ابھی اس کا دلہنا پا ختم نہیں ہوا ہے بقول اماں جان کہ۔“ وہ اس سے بھی زہر بھرے لہجے میں بولی۔ اور

صاف جھوٹ بول گئی۔

حالا کہ شہلا نے نہایت خوش اسلوبی سے باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ اماں لاکھ منع کرتی رہ جاتیں کہ ابھی تمہارے کام کاج کے دن نہیں ہیں۔ مگر وہ کب مانع بنتی۔

”عورت بنا کام کاج کے بیٹھی ہوئی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی اماں جان! اور مجھے کون سا پہاڑ توڑے ہیں۔ بس یہ چھوٹے موٹے کام ہی تو ہیں۔“

اماں جان تو اس کی ہر ہر ادھر پر غار جاتیں۔ وہ اماں کے پاس فارغ وقت میں بیٹھی ان سے ان کی باتیں سنتی۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔ گھر کی ملازمہ جنت بی بی اس کے گن گاتے نہ ٹھکتیں وہ عام سے چہرے والی اپنے اندر ایک سحر کھتی تھی یہ سحر اس کا ہمدرد دل، مخلصانہ اور محبت آمیز رویہ تھا۔ جیسی پرسکون پر اعتماد مسکرائیں، نظر انداز کرنے کی عادتیں تھیں۔

شمن ڈھونڈتی رہ جاتی کہ وہ کون سا سحر ہے جس نے پورے گھر بھر اور خاندان کی عورتوں کو بھی اس کا اسیر کر ڈالا ہے۔ جسے دیکھو تیور کی بیوی کے گن گاتے جا رہا ہے۔ بس شمرہ ہی تھی جو اس سے کھینچی کھینچی رہتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو نفرت کا کھلا اظہار کر ڈالتی۔ شمن جیلے بازی کرتی تو اس کا ساتھ دے کر خوب ہنستی۔

اس کا طرز عمل اماں جان کو بہت کھٹکتا۔ ایک روز انہوں نے اس کی خوب خبر لے ڈالی۔

”شرم کر دشرہ! کس بات کا انتقام لیتی رہتی ہو تم اس بچی سے۔ شمن تو پرانی لڑکی ہے میں اسے کچھ کہہ کر اس کا دل خراب نہیں کرنا چاہتی مگر تم تو اس گھر کی ہو۔ بھائی ہے وہ تمہاری، تمہارے چہیتے بھائی کی بیوی۔ کچھ تو لحاظ کرو۔ وہ اگر تمہیں جو اب کچھ نہیں کہتی تو یہ اس کی بڑائی ہے دگر نہ وہ پورا حق رکھتی ہے تمہیں اس لب و لہجے میں جواب دینے کا۔ اور

تیور بھی چھوٹی بہن سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔“

”آپ ہی پوچھا کیجئے اس ڈاڑھی کی۔ میں تو اپنا مزاج اس کے لئے نہیں بدل سکتی۔“ وہ پیر پٹخ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اماں تاسف سے گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

رشتے تو آسان پر طے ہوئے ہیں شمرہ! اس میں کسی کا کیا دوش۔ تیور اور شہلا کا جوڑ بھی اللہ نے بنایا ہے۔ اور اب اس پر مسلسل ناخوشی کا اظہار کرتے رہنا اللہ کے فیصلے سے سرکشی اس کی نافرمانی اور اس پر تنقید کرنا ہوا۔ اللہ تمہیں سمجھ عطا کرے۔

انہوں نے صدق دل سے بیٹی کے لئے ہدایت مانگی مگر جو خود ہدایت نہ پانا چاہے اسے کیوں کر ہدایت مل سکتی ہے۔ اس کے اندر تو نفرت کی خود رو جھاڑیوں کا جنگل اگتا جا رہا تھا جو روز بروز گھٹنا، جنگل ہوتا جا رہا تھا۔

شہلا کبھی کبھی حیران ہو جاتی کہ آخر اس نے شمرہ کا ایسا کون سا نقصان کر ڈالا ہے۔ جو وہ اس سے اتنی متحضر ہے۔ اس سے کھینچی کھینچی رہتی ہے۔

اس روز وہ بدحد دھکی ہوئی جب ایک بیٹے کو ختم دینے کے باوجود اس کی خوشی کو شمرہ نے ملایا میٹ کر دیا۔

”اوف.... اس قدر بد صورت بچہ۔ ہمارے خاندان کی سات پشتوں میں پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ ہے نا ای!“

وہ کارت میں سوئے بچے کو دیکھ کر حقارت سے بولی تھی تیور تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر اماں نے اسے خوب سنا دیں۔

”انیسے کون سے حسین بیٹے ہیں تمہارے خاندان میں کہ یہ اتنا اچھا بھلا تمہیں بد صورت نظر آنے لگا ہے۔ خدا کا خوف کرو شمرہ۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورت پر ہم بھلا کیا حق رکھتے ہیں۔ تنقید کا تمہارے پر نگلی ایک پھنسی تک تو ٹھیک کر لو۔ سستیں۔ دانت تک بنا نہیں

سکتیں۔ اور چلی ہو اس کی بے عیب ذات پر تنقید کرنے۔“

”چھوڑیں اماں! شمرہ تو یوں ہی مذاق کر رہی ہے۔“ شہلا فوراً درمیان میں بول پڑی۔ وہ ماحول میں پھیلی خوشی اور خوش گواری کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔

پہلے پہلے بچے اور وہ بیٹے کی سرست تیمور اماں اس کے رگ و پے میں اتری ہوئے تھی۔ وہ بھی خود کو ہلکا اور پرست محسوس کر رہی تھی۔

اسپتال سے گھر آئی تو تیمور نے اسے ڈائننگ کے ٹوپس دیے۔

”میں تو آپ کو ہیرے جیسا بیٹا نہ دے سکی تیمور۔“ وہ کانوں میں پڑیں بالیاں اتار کر ٹوپس پہنتے ہوئے بولی۔ اس کے لیے جس میں گرگٹ سی سے در آئی۔

تیمور نے بیڈ پر سونے بچے کو گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر بچے کو اس کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”تم نے شمرہ کی بات دل پر لے لی ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا اس کے منہ میں شرن کی زبان ہے۔ اس کی اپنی نہیں۔ دیکھو اسے غور سے۔ کیا یہ ہیروں موتیوں سے کم ہے۔“ اس نے آنکھیں موندے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ تو شہلا کی نگاہیں بھی اپنے بیٹے پر جم گئیں رگ رگ سے محبت کی لہریں بہنے لگیں۔ اس نے بے اختیار اس کے رخسار چوم لیے۔

”یاد ہے شہلا! جب میں تمہارے پیچھے بھاڑتا تھا اور تم مجھے ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ میں اپنے آفس میں جانے سے پہلے تمہارے جیب میں آکر جھانکتا تھا اور تم چڑچڑاتی تھیں۔ پھر ایک بار چڑھ کر پوچھا تھا مجھ سے کہ ایسا کیا نظر آ گیا ہے مجھ میں تیمور صاحب آپ کو؟“

تیمور بیڈ کی پشت سے لگ کر اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا تو شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ہاں یاد ہے۔ مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس وقت۔“

”ہاں اس لئے کہ اس وقت جواب جو میرے پاس تھا وہ اگر دے دیتا تو تم خفا ہو جاتیں! کچھ بعید نہ تھا کہ اپنا ہینڈل اتار کر میرے سر پر بجا دیتیں۔“

”ایسے ہی۔“ وہ آنکھیں پھیلا کر اسے گھورنے لگی۔ پھر بچے کو کارٹ میں ڈال کر ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا جواب تھا اس وقت آپ کے پاس؟“

اور جواباً تیمور اسے دل آویز نگاہوں سے دیکھنے لگا کہ اس کی پتلیں خساروں پر جھک گئیں۔

”تمہارے اندر ایک سحر ہے شہلا۔ ایک طلسم ہے جو میرے دل کو جکڑے ہوئے ہے۔ مجھے لگتا ہے تم مقناطیس ہو اور میں لوہے کا ٹکڑا۔“

”یہی تو پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایسا کیا طلسم ہے مجھ میں؟ میں تو بہت عام سی ہوں۔“ وہ سلجھے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر چہرے کے ایک طرف ڈال کر دھیرے دھیرے برش پھیرنے لگی۔

”ایک بات پوچھوں تیمور؟“ اس نے تیمور کی طرف دیکھا جو اس کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور اس کے ہاتھ سے برش لے کر اس کے بالوں کو نکھیرتے ہوئے بولا۔

”یہی پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ میں نے اتنی حسین جمیل شمن سے شادی کیوں نہیں کی جبکہ وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔“ تو بات یہ ہے ڈیکڑہ شخص کا معیار حسن مختلف ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ہر شخص چاند کا عاشق ہو۔ رات بھر چاندنی میں بیٹھ کر چاند کا نظارہ کرنا اچھا لگتا ہو۔“ اس کا لہجہ یک یک تنجیدگی میں سے دھل گیا۔ ”میں بڑا پریکٹیکل آدمی ہوں۔ ظاہری حسن

ظاہری حسن نہ میری کمزوری ہے نہ میرا تقاضا۔ میں اپنی شریک حیات میں خوبیاں دیکھنا چاہتا تھا باطنی خوبیاں۔ جو دیکھ رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شہلا کو بڑی نرم نظروں سے دیکھا پھر ایسی بنجیدگی سے بولا۔

”مجھے ہیوی چاہئے تھی۔ شوکیس میں سجانے کے لئے شوپیں نہیں۔ اور بات یہ ہے شہلا کہ میں نے اپنے ہم سفر کیلئے جو آئیڈیل بنا کر رکھا تھا یہاں تک سمجھو کہ میرے ذہن میں جو آئیڈیل تھا اس پر تم پوری اتریں۔ اسے تم وقتی ہم آہنگی سمجھ لو دل کا تمہاری طرف کھنچاؤ سمجھ لو یا کچھ بھی۔ یوں بھی دنیا میں حسین چہروں کی کمی نہیں ہے ہاں باطنی خوب صورتیاں عورت کے اندر سے بہت تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ ظاہری حسن آنکھ کو وقتی طور پر متاثر کرتا ہے مگر باطنی حسن دل کو اپنا اسیر کر ڈالتا ہے۔“

شہلا کو اپنے اندر بہت سبک سویرے اترتے محسوس ہونے لگے۔ وہ اپنے رب کے حضور وقتی بارگاہی سجدہ ریز ہوتی کم تھا۔ اس نے سوچا کہ ”پتا نہیں مجھ میں کیا خوبیاں ہیں بس اس کے شریک حیات کی نگاہوں اور دل میں اس کے لئے محبت کی جو جوت مل رہی تھی وہ اس رب کریم کی عنایت ہی تھی۔ میں تو فانی۔ عیبوں سے بھری۔ میری بساط ہی کیا تھی کسی انسان کے دل میں گھر کرنے کی۔

ہاں محبت تو جنت سے اترا ہوا تختہ ہے جسے چاہے رب کریم بخش دے۔



زندگی بڑی خوب صورت ہو گئی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس میں شرہ یا شمن کی نفرتوں کے آتش جیسے پڑتے تو وقتی طور پر ایک ملول سی چادر تن جاتی دل کی فضا پر مگر اسے تیمور اور اماں جان کی محبت، حمایت حاصل تھی۔ ان کی محبتوں سے دامن اتتا بھرا ہوا تھا کہ وہ شرہ کو ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھ کر معاف کرتی رہی۔ اور شمن کے تعذیب آمیز جملوں کو خاموشی سے

برداشت کر جاتی کہ بدلے میں اسے اتنی نعمتیں جوت مل جاتی تھیں۔

”شرہ، عمر سے یوں دور بھاگتی جیسے وہ جھوٹ ہو کوئی بلا ہو اس سے چٹ جائے گا۔ چلتے بھرتے اس کی سانولی رنگت پر چوٹ کرتی۔ اگلے سیدھے نام رکھتی اماں کی ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

انہی دنوں جب زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔ شہلا پھر ”امید“ سے تھی۔ کہ ایک دن اچانک تیمور کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ اس کے دوست نے، بی فون کر کے اطلاع دی تھی وہ میڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس خبر پر بدحواسی میں اس کا پاؤں رپٹ گیا وہ تیمور کا میڑھیوں سے پھسلتی چلی گئی۔

اماں اور شرہ بھاگ کر آئیں مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ادھر تیمور کے ایکسیڈنٹ کی خبر اور دوسری اس کی یہ حالت دیکھ کر اماں تو ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھیں۔ شرہ نے جلدی سے ڈرائیور کو آواز دی اور ملازمہ کے ساتھ شہلا کو گاڑی میں ڈالا۔

تیمور کا ایکسیڈنٹ اتنا شدید نہیں تھا بلکہ زخم آئے تھے اسے فرسٹ ایڈ دے کر اس کا دوست گھر چھوڑنے آ رہا تھا تو ملازمہ سے شہلا کے میڑھیوں سے پھسلنے کی اطلاع پا کر وہ پریشان ہو کر وہیں اسپتال دوڑ گیا۔

اماں تو اسے خیر و عافیت میں دیکھ کر پہلے خوش ہوئیں پھر دھازیں مار مار کر رونے لگیں۔

”تیمور! ڈاکٹر کہہ رہے ہیں شہلا کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔ اندرونی چوٹ لگی ہے اور..... اور بچہ بھی ضائع ہو گیا ہے۔“

انہوں نے بیٹے سے لپٹ کر روتے ہوئے اسے اتنے نقصانات کی خبر دی۔ وہ یونہی دم سادھے کھڑا رہ گیا۔ اس میں اماں کے لرزتے وجود تو کھام کر سہارا دینے کا بھی یارا نہ تھا۔

سے سکرائی۔

سیاہ چمکتے بالوں کی لٹیں رخساروں پر جھول آئی تھیں۔ دھیمے دھیمے قسم کے ساتھ وہ اسے دنیا کی حسین ترین عورت نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ عمر کو جھولا دیتے ہوئے شرارت سے اسے چھینرنے کی غرض سے گلگاتے لگی۔

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبے لگتی ہے ہم بوجھ اتارا کرتے ہیں
تیور ڈیوڑا کٹر سے پوچھو۔ دیکھو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بھلا۔“ اماں اسے سمجھو نے
لگیں۔

ڈاکٹر کے چہرے پر نکھری مایوسی اماں جان کو کھولانے لگی انہیں تو کچھ سنائی ہی نہ
دے رہا تھا ڈاکٹر کب کھڑا ہوا تھا۔

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبے لگتی ہے ہم بوجھ اتارا کرتے ہیں
تیور کی ساعوتوں اور بصارتوں پر دبیز دھند چھا رہی تھی۔ اماں نے نہیں سنا مگر تیور
نے سن لیا تھا کہ ڈاکٹر انہیں ایک ناقابل تلافی نقصان کی خبر سنایا گیا تھا۔



موسموں کے اس ملنے اور جدا ہونے میں
جانے دل کا کیا رشتہ ہے
جب اک موسم دوسرے موسم سے ملے ہیں
جانے کیوں اس دل کے اندر
دور کہیں

”مجھے کئی روز سے بڑے بڑے خواب آرہے تھے تیور میرا دل سوکھے
پتے کی طرح ہر وقت لرزتا رہتا تھا۔“

اس نے سر جھکا کر اماں کو دیکھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی طرح
بلک بلک کہہ رہی تھیں۔ اس کے ذہن کی سطح پر پیسے بڑی زور دار ضرب پڑی تھی۔
اسے یاد آیا۔ شہلا کئی روز سے وہموں کا ذکر کرنے لگی تھی۔ ہر وقت بے نام سے
اندیشے میں گھری رہتی تھی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے تیور اپنا نہیں کیوں..... میرا بچہ خیریت سے بھی آئے گا یا
نہیں۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ اسے جھڑک دیتا۔ پھر نرمی سے سمجھاتا۔
”اچھی اچھی باتیں سوچو۔ وہموں اور خوف کو جتنا سر پر چڑھاؤ گی وہ اتنا تمہیں گھیریں گے۔“
”میں کیا کروں؟ یہ خود ہی مجھے ہر وقت گھیر لیتے ہیں۔ تیور۔ اگر.... اگر
مجھے کچھ ہو گیا تو؟“

”شہلا ایوڈس ٹاپک۔“ وہ سخت برہم نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ تب وہ
اسنے زور سے کھلکھلائی کہ وہ ساری ناراضگی بھلا کر خود بھی ہنس دیا تھا پھر اس کا نازک ہاتھ
مرڈے ہوئے بولا تھا۔

”تمہیں کچھ نہیں ہونے کا۔ جو کچھ ہونا ہے مجھے ہی ہونا ہے۔“ پھر ایک آہ بھرتے
ہوئے بولا۔

جاں اب کے بچ گئی تو قمر عہد بھی یہ ہے
اب دل لگائیں گے نہ کسی سہم تن کے ساتھ
وہ عمر کی فیذا رٹھا کر جھولے کی طرف بڑھتے بڑھتے اس طرف دیکھ کر شرارت

ایک چھنا کا سا ہوتا ہے
جیسے کچھ شے کے برتن
اک وحشی آواز کو سن کر
تم ہاتھوں سے چھوٹ گئے ہوں
چھوٹنے سے دو ریت گھر وندے
بننے بننے ٹوٹ گئے ہوں
بھٹی رات کا سناٹا کیوں
خوف رگوں میں بھرتا ہے
پت جھڑ کی دلیز پر ٹھہرا
لحمہ کس سے ڈرتا ہے
وہ تو پورے جاند کی شب تھی جب اک تار اٹھاتا تھا
وہ تو بھری بہار کے دن تھے جب تو مجھ سے بچھڑا تھا

اس صدمے نے گھر کی ساری رونقیں جھین لی تھی۔ تعزیت کیلئے آنے والوں کا
ہجوم بھی ختم ہوا تو ویرانی اور شدید ہو گئی۔ تیرو کیلئے تو جیسے ساری کائنات ہی بے رنگ و بونہو
کر رہی تھی۔ وہ پہلے بھی کم گو تھا اب تو جیسے لوں پر قفل لگ گئے تھے۔
آفس سے آکر کچھ دیر عمر کے پاس بیٹھا رہتا۔ اسے خاموشی سے تکتا رہتا۔ اس
میں شہلا کا کس ڈھونڈتا رہتا پھر یک دم گھبرا کر اسے اماں جان کے حوالے کر کے خود کمرے
میں بند ہو جاتا۔

اور اماں اس کی اس حالت پر روتی رہتیں۔

”میرے بچے کی خوشیوں کو جانے کس کی نظر لگ گئی۔ اس کی ہستی ہستی زندگی کو

روگ لگ گیا۔“

”یہ سب شہلا بھائی کی وجہ سے ہوا ہے اماں۔“ ثمرہ کبھی کبھی دل کا بچھوٹا پھوڑ
جاتی۔ ”نہ وہ اس گھر میں آتیں نہ وقتی خوشیوں کے بعد ایسا اندہناک غم تیرو بھائی کی
زندگی میں آکر ٹھہر جاتا۔ روگی ہو گئے ہیں وہ تو۔“

”خدا کا خوف کر ثمرہ! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ کوئی اپنی خوشی
سے مری ہے۔ کیا اس نے ہستی مسکرائی زندگی کے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔ عمر کو اپنی
آنکھوں کے سامنے جو ان ہوتے دیکھنے کی اس کی خواہش نہ رہی ہوگی۔ بس اللہ کو منظور
تھا۔“

”ادبہ۔“ وہ جھنجھلا کر وہاں سے اٹھ جاتی۔ دراصل دل اس کا بھی دکھتا تھا تیرو کو
دیکھ دیکھ کر۔ اور وہ اپنے سارے آنسوئوں کے پاس جا کر بھائی تھی شہلا کے خلاف جی بھر کر
بھڑاس بھی اس کے سامنے نکالتی تھی اور وہ چپ چاپ سنتی کبھی کبھی تانید بھی کر ڈالتی۔

بہر حال..... وقت خود ہی مرہم ثابت ہوتا رہا ہے۔ زخم دھیرے دھیرے مندمل
ہونے لگے تھے۔ بس، کسک تھی جو دل کی تہوں میں رہ گئی تھی۔ جنہیں تیرو تنہائی میں
شدت سے محسوس کرتا رہتا۔ مگر اماں کی کوششوں سے یا پھر عمر کی وجہ سے بہل گیا تھا۔ آفس
کے بعد سارا وقت بیٹے کیساتھ گزارتا۔ چھٹی کے دن اسے اپنے ساتھ لیے گھومتا۔ اس کی
میٹھی میٹھی باتوں سے دل سیراب کرتا۔ اس کی شرارتوں پر ہنستا اور گھٹنوں اماں سے اس کی
باتیں کرتا رہتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھائی سال کا ہو گیا تو وہ اسے اسکول داخل کرانے کی فکر میں
پڑ گیا۔ ڈھیر سارے اسکولز دیکھ آئے۔

”اماں! اسے کون سے اسکول میں داخل کراؤں۔“ وہ الجھ کر اماں سے پوچھنے

لگتا۔ اس کے پاس اب سوائے عمر کے اور کوئی موضوع ہی نہ رہ گیا تھا۔ شرہ تو چڑ جاتی اسے عمر کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ تھا بھی وہ شہلا سے ملتا جلتا۔
”منحوس جاتے جاتے اپنا کس جھوٹو گئی میرے بھائی کی زندگی میں روگ لگانے کو۔“

”اوہر بیٹھو۔ اسکول بھی داخل ہو جائے گا، ابھی کون سا بڑا ہو گیا ہے۔“ اماں اپنے پاس اسے بیٹھنے کو جگہ دے کر بولیں اور عمر کو اپنی تسبیح دے کر ایک طرف بٹھا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

”عمر جتنا تمہیں پیارا ہے۔ اتنا مجھے بھی تم پیارے ہو۔ کیا بھول گئے ہو کہ میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو۔ عمر کی طرح ہی پیارے۔ دلارے۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ تم بیٹے ہو تو میرا دل سیراب ہوتا ہے۔ تمہارا چہرہ مسرور ہوتا ہے تو میری روح شانت ہوتی ہے۔ مگر جب تمہیں اجڑا ویران دیکھتی ہوں تو سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے۔

دل دکھ سے شق ہو جاتا ہے ابھی تمہاری عمر بٹنے کیلئے ہی ہے۔ پہاڑی زندگی پڑی ہے جو یوں نہیں گزارنے کی جس کا تم نے تہیہ کر رکھا ہے۔“

وہ بولتے بولتے رو پڑیں۔ تیمور کا دل لٹل ہو گیا۔ اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبا یا۔

”میں بہت خوش ہوں امی! آپ کیوں خود کو پریشان کرتی ہیں۔ یہ دیکھیں میرا پائٹرمیرے ساتھ ہے اور۔“

”نہیں تیمور۔“ اماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اولاد کبھی پائٹرمیں ہوتی۔ یہ زندگی کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ یہ بس نفعتیں ہوتی ہیں۔ خوشیاں ہوتی ہیں ہمارا مستقبل اس

سے وابستہ ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے خواب ہماری انگلیں ضرور وابستہ ہو سکتی ہیں مگر یہ عمر بھر کا تنگی ساتھی نہیں ہو سکتی۔ زندگی گزارنے کے لئے ایک غم گسار۔ ایک محبت کرنے والے ہم سفر کی ضرورت ہوتی ہے جو قدم قدم پر ہماری تنہائیاں پریشانیاں ہمارے دکھ سکھ شہر کرنا ہے۔“

وہ چپ چاپ سر جھکا کر رہ گیا۔ اماں کی بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ لمبی لمبی راتوں میں تنہائی کا احساس کسی عذاب کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اسے کبھی کبھی ایسے ہی ساتھی کی طلب ہونے لگی تھی۔ جب وہ دن بھر کی تھکن لے کر آئے تو وہ اس کی تھکن سمیٹ لے۔

ایسے کیسے نرم ہاتھوں کے لمس کی تمنا جانگے لگی تھی جو سارا بوجھ اٹھا لے۔ وہ اس سے باتیں کرے۔ ”بے“ روئے اور عمر کے مستقبل کے خواب اس کے ساتھ مل کر دیکھے۔

اس نے وہیں گاؤں کے سے فیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ”شمن اب بھی تمہاری منتظر ہے تیمور! اماں اپنا ہاتھ ہولے ہولے اس کے گھنے بالوں میں پھیرنے لگی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور ایک لخت جیسے بوجھ سارو چ پرست آیا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کے باوجود وہ آنکھیں نہ کھول پایا۔ بس دھیرے سے بولا۔

”کیوں کر رہی ہے وہ ایسا؟ بالکل پاگل ہے وہ۔“

”ہاں۔ پاگل ہی تو ہے۔“ فرنگ میں چیزیں رکھتی شرہ کے اندر سے ایک سر و قدم کی آہ نکل گئی۔ وہ بس تیمور کو دیکھ کر دوبارہ کچن میں چلی گئی وہ وہیں خاموشی سے کام کرتے ہوئے ماں بیٹے کی باتیں سن رہی تھی۔

اس نے کتنے رشتے مسترد کر دیئے ہیں۔ اب تو راشدہ (شمن کی امی) بھی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ تیمور مان جائے تو..... چلو تم اس شمن کی بچکا نہ ضد سمجھ لو مگر عمر کے لئے سوچو

اپنے لئے سوچو۔ میں بوڑھی کب تک ساتھ رہوں گی۔ اور ادھر شرہ کی بات بھی طے ہو چکی ہے۔ دو سال پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے اور وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ اور مجھ میں دم نہیں کہ میں گھر بار سنبھال سکوں۔ مجھے بھی آرام چاہئے تیمور! ہو آ جائے گی تو مجھے بھی سہولت ہو جائیگی اور تمہاری زندگی بھی۔“

”اماں!“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جن میں سرخیوں دوڑ رہی تھیں۔ شدت کرب سے لب بھیچے وہ سیدھا ہوا کر بیٹھ گیا اور دھیرے سے بولا۔

”ایک فیصلہ میرا تھا۔ آپ نے سر آنکھوں پر رکھا۔ اب ایک خواہش آپ کی ہے میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“

اس نے ایک گہری سانس بھری وہ با مشکل مسکرا رہا تھا مگر اس کی مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ اس نے اماں کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا۔

اماں تو خوشی سے نہال ہو گئیں۔ بے اختیار اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ادھر شرہ بھی خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اور بچن سے نکل کر شن کیے خوش خبری سنانے فون کی طرف دوڑ پڑی۔

شن اس گھر میں آخر کار بہو کے روپ میں ہی آ گئی اور دو سال بعد شرہ اس گھر سے وداع ہو گئی۔

شرہ کی شادی سے مہینہ بھر پہلے فہد کی پیدائش ہوئی تھی۔

گورے چنے فہد کو دیکھ کر شرہ تو نہال ہو گئی۔

”باں یہ بے میرا اصل بیٹبچا۔“ اس نے کہا تو اماں نے اس کی پشت پر ہاتھ بڑ

ڈیا۔

”اصل اور نقلی کیا ہوتا ہے۔“

”اصل یہ کہ ہمارے خاندان کا معلوم ہوتا ہے، خوب گورا چٹا بالکل اپنی امی پر گیا ہے اور مجھ سے بھی ملتا ہے۔ ہے نا۔“ وہ اسے گود میں اٹھائے تبصرہ کرنے لگی۔ اور شن بیڈ پر سفید چادر میں اوڑھے تقاضے پیٹھی دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔

تیمور بھی بیٹے کی ولادت پر خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ عمر کی گود میں فہد کو ڈالتے ہوئے بولا۔

”یہ دیکھو پانرٹن۔ تمہارے لیے چھوٹا سا کھلونا آ گیا ہے تم اس سے اب کھیلنا۔“

”ارے واہ۔ میرا بیٹا کھلونا کیوں ہونے لگا۔“

شن نے جھٹ سے عمر کی گود سے بیٹے کو کھینچ لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

”آپ کا بیٹا ہوگا اس کے لئے کھلونا۔ یہ تو شہزادہ ہے میرا۔“ وہ عمر پر ایک نخوت

بھری نظر ڈال کر بولی تو تیمور کی پیشانی حکسن آلود ہو گئی۔ تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔

وہ شن کی عمر سے نفرت محسوس کر رہا تھا بلکہ اب تو فہد کی پیدائش کے بعد اس کی نفرت شدت سے ظاہر ہونے بھی لگی تھی اور اس میں شرہ بھی شامل رہتی تھی۔

وہ جب بھی میکے آتی اس کی تمام توجہ کا مرکز فہد ہی ہوتا۔ وہ بھول کر بھی عمر کا نہ پوچھتی نہ اسے پیار کرتی۔ فہد کے لئے ہی چھوٹی موٹی چیزیں لے کر آتی۔

”آج میں احمر کے ساتھ گئی تھی یہ سوئٹ سوٹ پسند آیا میں نے فہد کے لئے لے

لیا۔ اس پر یہ رنگ بہت کھلے گا بھی۔ ہے بھی تو شہزادوں جیسا۔“ وہ جیسے عمر کو سنانے کو بخوتی

اور ادھر اماں اس کی اس پکانہ ذہنیت پر کھس کر رہ جاتیں۔ مگر شرہ کے دل رکھنے کے خیال

سے اسے اب زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کرتیں چونکہ شرہ کے لگا تا رورو بچے ضائع ہو چکے تھے۔

اس کی شادی کو تیسرا سال لگ رہا تھا اور وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔

سو اس وجہ سے تیمور بھی اس کی باتوں کو اس کا عمر کو نظر انداز کر دینے کا نوٹس نہ

لیتا۔ نہ اسے سرزنش کرتا۔

پھر چوتھے سال شہرہ کو بڑی خوشی ملی اس نے ایک بڑی موٹی سی بچی کو جنم دیا جس کا نام عینید رکھا گیا۔ سب کو ہی یہ بڑی پسند آئی تھی جس نے تو سمجھتے تھے اسے اپنے فہد کے لئے مانگ لیا۔

اماں نے کچھ برا مانایا۔

”فہد کیوں؟ عمر بڑا ہے۔“

”نہیں اماں، فہد میرا بیٹا ہے اور یہی میرا داماد بھی بنے گا۔“ شہرہ بھی شمن کی حمایت تھی۔ عمر کے لئے اس کے لہجے میں کوئی محبت، کوئی نرمی نہ تھی۔ اماں چپ سی رہ گئیں وہ کیا کہہ سکتی تھیں۔ نہ بیٹی ان کی تھی نہ بیٹا۔ ہاں وہ ان دونوں عورتوں کی ذہنیت پر دھکی ضرور ہو جاتیں اکثر و بیشتر وہ تیمور سے کہتی رہتیں کہ وہ شمن پر سختی کرے کہ وہ عمر کا بھی خیال رکھا کرے۔ اسے نظر انداز نہ کرے۔ مگر تیمور کے پاس اتنا وقت بھی کہاں ہوتا تھا کہ وہ ان معاملوں میں خود کو الجھائے۔ اس نے تو جیسے خود کو کاروبار میں گم کر لیا تھا۔ کبھی اماں سختی سے کہتی تو وہ ہنسنے لگتا۔

”یہ آپ ہی کی پسند کی بہو ہے۔ جس میں بقول آپ کے ہر خوبی ہے۔ اس نے مگر سنبھال لیا ہے اماں۔ بس یہی چاہتی تھیں نا آپ۔“
اور اماں اسے دل گرفتگی سے دیکھ کر رہ جاتیں۔
زندگی رواں پانی کی طرح گزرتی رہی۔

”دلوں میں محبتیں سٹ گئیں اور نفرتوں کی خود رو جھاڑیاں اپنی جڑیں پھیلاتی رہیں۔ اور آج اور آج ایک تاریک ویران خوف ناک جنگل نظر آ رہا تھا۔ جس نے عقل سلب کر لی تھی۔ اپنے زیاں اور زوال کے احساس سے بے پروا کر دیا ہے۔ بے حس، تنگ

دل کر دیا ہے۔“

اماں جان کی گہری سانس سینے کی تہہ سے خارج ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں ماضی کے حوالے سے نئی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ادھر شہرہ کے بہتے آنسو بھی ٹھہر گئے۔ اس نے لاؤنج کے صوفے پر سر ٹکائے ٹکائے اماں کی آواز میں آنسوؤں کی نمی واضح محسوس کی۔ پھر ایک گہری پر ملال سانس بھر کر جیسے خود بھی ماضی کی کھاڑی سے نکل آئی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دروازہ کھول کر اس کمرے میں جائے۔ بیٹی سے نظریں ملائے۔ پیلے ہی وہ شرمسار تھی اب تو سارا ماضی اس کے سامنے بھی کھل چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مضطربانہ انداز میں ٹپٹپٹ لگی۔ پھر کسی خیال کے تحت فون کی جانب بڑھیں دوسرے پل وہ عمر کے آفس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔



”لیس..... عمر اسپیکنگ!“ عمر کی سمیٹھر آواز انہیں سے ابھری۔
”ہیلو۔“

”ہیلو پلیز۔“ مسلسل خاموشی پر اس نے ذرا سا چونک کر ریسیور کو دیکھا تب اسے ہلکی سی سانس کی آواز سنائی دی پھر شرہ کی آواز ابھری۔
”میں شرہ بول رہی ہوں عمر۔“ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی جیسے وہ کہیں دور خلاء سے بات کر رہی ہو۔ یہ دھیمہ انداز ان کی دل شکستگی کی غمازی کر رہا تھا۔
”ہیلو، ہیلو، عمر میں شرہ بول رہی ہوں۔“

انہوں نے اب کے ذرا اونچی آواز میں کہا مگر دوسری طرف لائن میں گہری خاموشی تھی پھر ریسیور کے رکھنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ گویا عمر نے ان کی آواز سننے ہی

ریسور رکھ دیا تھا۔ وہ ان سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی اور بے چارگی آمیز کرب کے ساتھ وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہ گئی۔ پھر خود بھی ریسور کر لے کر ڈال دیا۔

عجیب بات تھی سبکی اور اہانت کے احساس کی بجائے بے بسی اور لا چاری محسوس ہونے لگی تھی۔

اضطراب اور تمکین روح پر آبلے کی طرح ٹپکنے لگی تھیں۔ نگاہوں تلے عینہ کا پھیکا‘ زرد اور آنسوؤں سے تر چہرہ گھومنے لگا۔

شدت کرب سے انہوں نے آنکھیں موند لیں جیسے درد سے پھٹنے سر کو سنبھالا دینا چاہا ہو۔



اماں جان کے خاموش ہو جانے کے بعد کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ عینہ کی نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ اس کا ذہن خالی اور کسی حد تک ماؤف ہو رہا تھا۔

اعصاب پر یوں سناٹا طاری تھا جیسے ہوا سے محروم چاند پر ہوتا ہوگا۔ اماں نے اس افسردگی کے بحر میں جکڑے جکڑے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر زنی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”میں عمر کو سمجھاؤں گی۔ تو فکر نہ کر۔ وہ میری بات ضرور مانے گا۔ وہ ختم مزاج نہیں ہے۔ اس نے یہ سب کسی انتقام لینے کیلئے نہیں کیا۔ وہ تو یوں بھی ابھی شادی کے لئے راضی ہی نہیں تھا۔ میں ہی اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ اب اسے سمجھاؤں گی‘ بھلا اتنی پیاری لڑکی کے لیے وہ کیسے انکار کرے گا۔“

اس نے شدت کرب سے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں جکڑ لیا اور بھیگی بھیگی پلکیں موند لیں۔

محبت کوئی خیرات تو نہیں ہے جسے کہہ رہو دو کرو دوازے کی چوکھٹ پکڑ کر مانگ لیتیں۔

وہ سکڑ تو نہیں ہے جسے کہہ کر کھول بڑھا کر حاصل کر لیتیں۔

نانو کتنی نادان ہیں۔ اس کی خوش فہمیوں کی تو چادر کا ٹانکا ٹانکا ادھر چکا تھا۔ اب وہ نئے سرے سے ایسی کوئی چادر بننے کی سکت کہاں رکھتی تھی۔

محض مسکراہٹ کو محبت سمجھ لیتا۔

تھانے والے ہاتھ کو عمر بھر کا سہارا سمجھ لیتا۔

لحلوں کی خوش گو اور رفاقت کو دائمی سمجھ کر خواب بن لیتا۔ ”زنی خوش فہمیاں اور

نادانیاں ہی تو تھیں اس کی۔ ایمن علوی سچ کہتی تھی۔ ”محبت میں جنوں خزیاں اچھی نہیں

ہوتیں۔ طوفان آخر کار طوفان ہی ہوتا ہے اس کی تہ میں جا ہیماں ہی کٹی ہوتی ہیں۔“

”عینہ میری بچی‘ اپنی ماں کو معاف کر دینا۔“ اماں جان کی آواز میں آنسوؤں کی

پورش تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں‘ پھر بے اختیار سر ناٹو کی گود میں ڈال دیا اور بلک اٹھی اور

اتار دلی اتار دلی کہ بدن کا پٹنے لگا۔ مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا گیا ناٹو۔ میں نادان اور کم

سن تو نہیں تھی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا گیا کہ عمر سن آٹنی کے بیٹے نہیں ہیں۔ اور.... اور یہ کہ

مجھے بچپن سے فہد سے منسوب رکھا گیا تھا۔“ وہ ہچکچوں کے درمیان بولی۔

”ہاں شاید۔ یہاں ہم سے بڑی غلطیاں سرزد ہو گئیں۔“ اماں جان ایک گہری پر

مول سانس بھر کر رہ گئیں۔ انہیں لگا جیسے ان کے پاس تسلی دینے کے لئے الفاظ ختم ہو چکے

ہیں۔ یوں بھی اپنے جملوں اور لفظوں کی کم مائیگی کا احساس ہو تو الفاظ گرفت میں نہیں آتے‘

لفظ اندر ہی ٹھہر جاتے ہیں۔

دوسرے دن اچانک ایمن آگئی اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے خاصا شاک لگا۔

”عینہ! یہ..... یہ کیا حالت بن کر ہے؟“ اسے بخار میں پھٹکتا ہوا دیکھ کر اس نے شمرہ کی طرف دیکھا جو اسے زبردستی سوپ پلا رہی تھیں۔
 ”آئی! آپ نے مجھے بتایا نہیں، یہ کب سے بیمار بنے خدا خدا کر کے تو یہ بستر سے اٹھی تھی پھر لگ گئی۔“

شمرہ نے لب دانتوں میں دبالیے اور سوپ کا پیالہ سائڈ میز پر رکھ کر بیڈ سے اتر کر بیروں میں سلیپر ڈالتے ہوئے بولیں۔
 ”اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تمہیں فون کر کے بتانے ہی والی تھی۔ بیٹھو تم اس کے پاس شاید اس کا دل بہل جائے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھا جو بڑی سر دی لگا ہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی، پھر لگا ہوں کا رخ موڑ کر ایمن کو دیکھنے لگی جو اپنا شولڈر بیک ایک طرف رکھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

شمرہ کمرے سے جاتے جاتے دروازہ بند کر گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں۔ کہ وہ اپنے جی کا غبار پانی ہمدرد دوست کے سامنے نکال لے۔ اور ایسا ہی ہوا کہچہ دیر بعد اس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ مضطرب سی لای میں نکل آئیں۔

”کیسے لوٹاؤں تمہاری خوشیاں؟ کہاں سے واپس لاؤں تمہاری وہی چپکاریں مہکاریں؟“ وہ کرب سمیٹے کہیں کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کس منہ سے عمر کے پاس جاؤں؟ یہ آگ میری ہی تو لگائی ہوئی ہے جو آج وہ لوٹا رہا ہے وہ سب ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ اس کے دامن میں میری طرف سے نفرت کے کاغذ بے گانگی ہی تو ڈالی گئی ہے اور آج..... آج وہ سب لوٹا رہا ہے تو وہ سفاک اور ظالم لگ رہا ہے۔

”خمن! تم نے اپنی نفرت اور محبت کے درمیان میری ہستی کو گھسیٹ لیا۔ مجھے

میرے اپنے خون، گھسے خون سے دور کر دیا۔“ اماں کہہ رہی ہیں وہ منقسم مزاج نہیں ہے۔“ ہاں بھلا اس کی ماں کب منقسم مزاج تھی۔

اس نے کب پلٹ کر میری زہر بھری باتوں کا جواب دیا تھا۔ بلکہ اس نے تو میری نفرت کا جواب بھی محبت سے دیا تھا۔

انہیں یک دم شہلا یاد آئے گی۔ اس کی اچھائیاں، خوبیاں اب دکھائی دیں گی۔ ان کا دل غیر شعوری طور پر شمن اور شہلا کا موازنہ کرنے لگا تو انہیں شہلا کا پلڑا ہر لحاظ سے بھاری لگا انہیں آج احساس ہوا کہ تیور نے واقعی ایک ہیڑے جیسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے خلوص اور محبت میں گندھی ہوئی لڑکی سے محبت کی تھی اور بھلا ایسی چاہنے والی پر خلوص رفیق کو کون بھلا سکتا ہے۔

آہ..... وہ آج ہوتی تو ضرور عمر کو راضی کر لیتی۔ ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے وہ اماں جا بگی بات مان لے۔“

امید کی کرن ان کے دل کے گوشے میں جھلگئی۔ ماپوی اور دکھ کے دبیز اندھیرے میں یہ چھوٹی سی ”کرن“ بھی بہت بڑا سہارا تھی۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے سر نکا کر دل میں دھیر ساری دعائیں مانگ لیں۔



ادھر ایمن کے علم میں ساری صورت حال آئی تو رنج سے اس کا دل شق ہو گیا۔ عینہ کی اجڑی صورت نے اس کے دل کو دکھ سے جکڑ لیا۔

اس نے ابھی اور اس وقت عمر سے بات کرنے کی کٹھنی تو اس نے اسے روکا۔
 ”نہیں ایمن، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ سب میری ہی نادانیاں اور خوش فہمیاں تھیں۔“ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا مگر ایمن مانی نہیں۔

”صرف ایک بار بات تو کرنے دو۔ اس کے انکار کے چھپے کیا جواز ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے عینیہ کہ وہ محض تماشا شاعری ہو۔ اس کی طرف سے بہر حال تیل تو چھڑکا گیا ہے۔“ امین نے اس کے تال تال کرنے کے باوجود عمر کے آفس کا نمبر لیا اور فون سیٹ کے ساتھ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ایک موہوم سی امید نے پھر دل کے اندر کے دیوار اندھیرے کو کاٹنے کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک بے چارگی آئیز کرب کے ساتھ بیڈ کی پشت سے لگ کر آنکھیں موند لیں۔ فون عمر نے ہی ریسو کو کیا تھا مگر اجنبی آواز پر ذرا حیران ہوا تب اس نے تعارف کر لیا۔ ”میں امین علوی ہوں عینیہ کی بیسٹ فرینڈ۔“ اس نے بیسٹ پر زور دیا تھا۔ ”اوہ۔“ اس کے ہونٹ غیر محسوس طور پر باہم بچھ گئے۔ اس نے ریسو کو ایک نظر دیکھا مگر خاموش رہا۔ تب وہ بولی۔

”عینیہ کے منع کرنے کے باوجود میں نے آپ کو فون کیا ہے کیا آپ اس کی حالت سے واقف ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے عینیہ پر نظر ڈالی جو ابھی تک آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔ کیا ہوا اسے؟“ دوسری طرف انتہائی انجان بننے کا مظاہرہ ہوا تھا یا حقیقتاً لاعلم تھا؟ امین سمجھ نہ سکی تاہم اسے غصہ بہت آیا اس کی اس مصنوعی یا حقیقی لاعلمی پر۔

”یہ کیسے ممکن ہے عمر صاحب کہ وہ اس بچ پر آنکھیں پھینکے اور آپ بے خبر ہوں آپ تک آنکھ نہ پھینچی ہو۔“ وہ استہزاء سے ہنسی تھی۔ عمر کو یک دم اپنی کپٹیوں پر شعلہ سالکیتا محسوس ہوا۔ تاہم وہ غصے کے اس ابال کودا بتاتے ہوئے رسائییت سے بولا۔

”مس امین۔ اول تو میں اپنے پرسنل معاملے میں کسی غیر کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔“ وہ غیر پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”اور دوم یہ کہ آپ کی آئینہ کی ملی ڈانڈیوں میں حصہ دار ہرگز نہیں ہوں کسی کو چاہتا ذاتی فعل ہے اس سے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔

اب یہ اس کے اپنے خواب تھے۔“

”مگر ان خوابوں میں آپ نے کچھ تو رنگ بھرے ہوں گے، وہ نادان تھی تو آپ نے اسے روکا نہیں حالانکہ یہ آپ کا اخلاقی فرض بھی تھا وہ کسی قدر نرم آواز میں بولی۔ وہ محض عینیہ کی خاطر نرم لہجہ اپنائے ہوئے تھی وگرنہ اس کی حالت کے پیش نظر اس کا تو دل چاہ رہا تھا ہم بن کر اس شخص پر پلاسٹ ہو جائے اور اس کے پرچھے اڑا دے۔

اس کی بات سچی تھی عمر کے اندر اضطراب کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ایک ضرب سی پڑی تھی اعصاب پر۔ وہ ہونٹ بھیج کر ہلکی سانس خارج کرتے ہوئے دفاعیہ انداز میں بولا۔ ”میں نے کہا نا کسی کو چاہنا پسند کرنا ذاتی فعل ہے اس حق سے بھلا کو کسی کو دست بردار کر سکتا ہے۔“

”مگر آخر کی کیا ہے عینیہ میں کہ آپ نے اسے رد کیا ہے؟ اس کی بے لوث چاہت کو نظر انداز کیا ہے اور۔“ امین ایک دم پھٹ ہی پڑی۔ تب عینیہ لپک کر آئی اور اس کے ہاتھ سے ریسو رچھین لیا۔

”پلیز امین۔ بس کرو۔ مجھے اس کی نظروں میں اتنا تو مت گراؤ۔ میں تو خود اپنی نظروں میں بھی گر چکی ہوں۔“

امین نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر ریسو کو بیڈل پر رکھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔



وہ آفس کی ریوایونگ چیئر پر بڑی کسل مندی سے بیٹھا ہوا تھا۔ فائل اس کے

ماننے کھلی پڑی تھی۔ اس میں پن کی صفحہ جھپکے کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے مگر اس کا ذہن ان صفحات سے کہیں زیادہ منتشر اور مضطرب تھا۔

ریسور رکھنے کے بعد وہ خالی ذہن فائل پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ اس میں لکھے الفاظ بے مقصد لکیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ دل خلش کا شکار تھا اور یہ کیفیت اس کی کوئی بے منتہی بھرتی تھی۔ وہ مسلسل بے نامی خلش اور اضطراب میں مبتلا تھا۔

اس کا خیال تھا جو سر اسر غلط تھا کہ وہ اپنے دل پر رکھا ہوا ابو جھاتا رچکا ہے اور بہت خوش ہے۔ شرمہ کا تاریک پڑتا چہرہ اس کی پیشینیاں اسے سرور کر رہی تھیں۔

وہ فاتح ہے اور فاتح لیڈر کی طرح ہی شاد اور مطمئن ہے۔

مگر.....

طمانیت مسرت اسے تو نہیں کہتے۔

یہ کیسی طمانیت تھی جو اسے دل میں یوں چھو رہی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا کانٹا اندر تار گیا ہو اور مسلسل کھٹک رہا ہو۔ مسرت ایسی وحشت ناک اور مضطرب احساس کا نام تو نہیں جس سے تاحال وہ گزر رہا تھا۔

اس نے فائل بند کی اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

اسے اچانک کمرے میں جس کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہاں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ اے۔ بی جی اس نے کچھ دیر بعد بڑھتی ٹھنڈ کی وجہ سے بند کیا تھا مگر..... کیا کرتا اس جس کا جو اندر تھا بے حد بے حساب۔

وہ سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑانے لگا۔ شاید اس طرح ذہن پر چھائی دھند چھٹ جائے یا اپنی سوچوں کے حصار سے دھنک سکے۔

باہر ٹریفک کا جھوم تھا۔ گاڑیوں میں ڈور تے فٹ پاتھ پر چلتے لوگ اپنے آپ

میں مگن زندگی کی دوڑ میں ایک بہتر زندگی حاصل کرنے میں سرگرداں دکھائی دے رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی زندگی سے شاد اور مطمئن نظر آ رہا تھا یا جھٹکیا۔ اس کا خیال تھا۔ اس وقت ہر شخص اسے اپنے آپ سے زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

چونکہ اس کی بے گلی حد سے سواتھی اور وہ خوشنہیں جان پارہا تھا کہ وہ اب چاہتا کیا ہے؟ اس اضطراب مسلسل کا تریا کیا گیا ہے؟ وہ گھر آیا تو شرمہ پر نگاہ پڑی۔ وہ اماں کے ساتھ لابی میں ہی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

اندر ہی اندر کی جان بھرمانہ احساس لگنے لگا۔ وہ نگاہوں کا زاویہ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگی جب کہ وہ اماں جان کو سلام کر کے اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

”آپ بات کریں نا اماں۔“ شرمہ اس کے جاتے ہی دے لہجے میں اماں سے بولی۔ اماں نے تسبیح ایک طرف رکھی اور چائے کا گلگ اٹھالیا۔

”رات تیمور نے اس سے بات کی تھی مگر وہ نہیں مانتا اب بھلا میرے پاس کون سا جادو ہے جو وہ مان جائے گا۔“

شرمہ نے بے جا رگی آمیز کرب سے لب دانتوں میں دبا کر رہ گئی اور سامنے دیوار کو گھورنے لگی۔

”سنجبل جائے گی وہ تو خود وقت گزر جانے دو۔“ اماں ڈھارس دینے والے لہجے میں بولیں تو وہ گہری سانس بھر کر نفی میں ہلائے لگی۔

”نہیں اماں! اعینہ کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بے شک وہ چپ سادھ لے گی مگر اندر سے ٹوٹ جائے گی، کھڑ جائے گی۔“

”تو یہ سب تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا۔“ اماں جان نے ترجیحی نکائیں اس پر ڈالیں تو بھرمانہ انداز میں سر جھکا کر رہ گئیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں

”میں بات کروں اس سے؟“ اس کے لیے میں التجا بھی تھی۔ وہ ساری نفرت حقارت جانے کہاں جا سوئی تھی۔ اس وقت تو وہ ایسی بھکاری معلوم ہو رہی تھی جسے ہر حال میں اپنا کھٹکول بھرتا ہو۔

اولاد کی محبت نے برف کی طرف پٹھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پھوپھو“ بن کر نہیں ماں بن کر عمر کے پاس جانا چاہتی تھی ایک بیٹی کی ماں بن کر۔

”نہیں“ آج رہنے دو۔ وہ کچھ تھکا اور پریشان سا لگ رہا تھا۔ میں خود بات کروں گی۔“ انہوں نے اسے روک دیا پھر اسے اٹھاتا دیکھ کر بولی۔

”کہاں جا رہی ہو؟ تیور آتا ہی ہوگا۔ رات کا کھانا کھا کر جانا۔ فہم چھوڑ آئے گا۔“

”نہیں پھر کبھی سہی۔“ وہ دانستہ دامن بچا گئیں۔ مگر کے اس کھینچے کھینچے ماحول میں انہیں اپنے جرم کا احساس شدید ہونے لگا تھا۔ ایک طرف بھاؤ جنم کا رویہ بھی ناقابل برداشت تھا۔ وہ اس سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔ وہ ساری محبت جو کبھی نظر آتی تھی اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اور شنم کا یہ رویہ شرم کے لئے کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس کی خیر خواہ اس کی حمایتی اور ہمدرد رہی تھی۔ مگر آج اس پر پڑی تو اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ جیسے سراسر قصور وار وہی اکیلی ہو۔ جب کہ نفرت کا پہلا بیج تو اس کے اندر بھی خود شنم نے ہی بو یا تھا شہلا کے خلاف..... اور پھر عمر کے خلاف۔

وہ غمزدہ حال قدموں سے وہاں سے چلی آئیں۔



آج کئی دنوں بعد وہ کان ل آئی تھی۔ ایمن اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ یہ سب اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

وہ چند دنوں میں ہی کئی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ ایمن کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے زندگی کی رونقوں کی طرف پھر کھینچ کر لانا چاہتی تھی جس سے وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اسے لان میں بٹھا کر برگر لینے لگی اور جب واپس آئی تو وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

”عینہ! اس طرح دل جلانے سے کیا حاصل۔ اس سے تو یہ بہتر ہے تم اس سے دو ٹوک بات کر لو۔“

”کیا بات کروں؟ وہ تو اسے میری نادانیاں سمجھتا رہا ہے۔“ اس نے بیگ کے اوپر ہی خانے سے ٹشو نکالا اور آنکھیں پونچھنے لگی۔

اک جان سوز نامراد خلش

اس طرف ہے ادھر نہیں ہوتی

وہ بے چارگی سے ہنس پڑی۔ پھر اس کے ہاتھ میں پیکٹ دیکھ کر بولی۔

”یہ کیا اٹھا لاتی ہو۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے آپ کی بھوک اور نیندیں سب اڑ چکی ہیں مگر ڈیڑہ..... کتنے دن بھوکی رہ سکو گی تم؟“

ایمن نے اس کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا اور پیکٹ کھول کر ڈسپوزل پلیٹ میں اس کا برگر رکھ کر اس کے آگے کر دیا۔

”بات بھوک کی نہیں“ طلب کی ہے اور اس وقت مجھے بالکل طلب نہیں ہو رہی ہے۔“ اس نے دوبارہ گھٹنوں میں سر دینا چاہا کہ ایمن نے اس کا سر اونچا کیا اور آنکھیں دکھائیں۔

”اچھے دوست بھی نصیب والوں کو ملتے ہیں ناقدری پھر تمہیں ہی شکوہ ہوگا کہ

دوستوں نے بھی دل داریاں چھوڑ دیں۔“ وہ ہنسی۔ ”اور سنو کیا تم اس شخص کے لئے مجھے بھی چھوڑ دو گی۔ مجھے بھی خفا کر دو گی۔“

اس نے تڑپ کر اسے دیکھا، پھر بے بسی سے ہونٹ بھیج کر دیوار سے پشت لگاتے ہوئے بولی۔

”یہ جذباتی بلیک میلنگ ہے ایچی۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔ ایمن ہنس پڑی اور اس کی پیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں زبردستی پکڑا دے ہوئے بولی۔

”جذباتی بلیک میلنگ بھی تو ہیں کام آتی ہے ناجاں اپنا نیت ہو۔ جذبوں کو سمجھنے والا محسوس کرنے والا اور قدر کرنے والا ہو۔ چلو شاہاش، تھوڑا سا کھالو۔ مجھے پتا ہے تم نے ناشتا بھی نہیں کیا سڑی چائے پی کر گھر سے نکل آئی ہو اور اب جا کر لٹچ بھی نہیں کر دو گی۔“ وہ اس کے آگے ہار گئی اور طلب نہ ہونے کے باوجود محض اس کا دل رکھنے کو کھانے لگی۔

”سنو میری مائو تو اس سے ایک بار مل لو۔“

”کیا کہوں گی اس سے؟“ اس نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔ دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا ”تیور ولا“ جانے کو اور اس تم گرو ایک نظر دیکھنے کو۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے“ اس کا دل وہاں جانے کا سوچ کر ہی معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔ ذہن اکسانے لگا۔

”اب یہ بھی میں ہی بتاؤں کہ کیا کہو گی۔“ ایمن اسے گھور کر دیکھتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہنے لگی۔ ”میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ جاتے ہی ہم کی طرح پھٹ پڑو۔ اس کے خوب لتے لو اور.....“ ایمن نے دانت یوں پیسے جیسے دانتوں تلے عمر تیور ہی آگیا ہو۔ وہ اس کی کیفیت پر دھیرے سے مسکرا دی۔

وہ اسے کیا بتاتی کر اسے دیکھ کر اسے جانے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ دھوپ میں رکھی برف کی طرح پگھل کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ظلم میں جھک کر اس کے الفاظ کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ شاید اس کی آنکھوں کی خوب صورت جھیلوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

تم نے دیکھیں ہیں وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ زندگی جس کے تصور میں لٹا دی ہم نے تم پر انھیں ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں تم کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے ”ہو سکتا ہے عینہ وہ تمہارا الاشوری طور پر منتظر بھی ہو۔“

ایمن کہہ رہی تھی اور اسے اپنے رگ و پے میں ایک نئی توانائی سرایت کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس نے بس ایمن کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اندر ہی کہیں امید کے دیپ حل اٹھے تھے۔



بارش کی یونندیں بے داغ شیشے پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ بہت ہلکی ہلکی یونندیں ہوا کے ساتھ صبح سے جاری تھیں۔ اس نے کھڑکی کا ہٹ پورا کھول دیا۔ اسے بارش سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ وہ کیسٹ پیلیر سے نکلنے والی اس غزل کو دلچسپی سے سن رہا تھا جو شاید کسی ملازمت کے کوارٹر سے آرہی تھی۔

دشت تنہائی میں، اے جان جہاں عرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
اندر ہی ہے قربت سے تیری سانس کی آغ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تیری دلدار نظر کی وہ شبہم

اس کا دل چاہا وہ اس آواز کو تیز کر دے اتنی تیز کہ اس کے اندر کا وحشت ناک
شور دب جائے۔ اس کے دل سے اٹھنے والی آازوں کا دم ٹوٹ جائے۔

اس قدر پیار سے، اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ابھی صبح فراق
ڈھل گیا، بھر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

اسے لگا غزل کے بول اس کے اندر کی وحشت کو اور بھی ہوا دے رہے ہوں۔ ایک
عجیب سی افسردگی نے اس کے دل کے گرد جال سا مین لیا تھا اسے یہ کیف آگئیں ماحول یک
دم اداس اداس لگنے لگا۔

بھینکے بھینکے سبز چٹوں میں بھی حزن محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یاد تھا ایسے خوشگوار موسم
میں اس کا موڈ بھی خوش گوار ہو جایا کرتا تھا اور وہ فوراً ہی رنگ اور برش اٹھا کر کوئی شاہکار
تخلیق کرنے لگتا۔ آفس میں ہوتا تو وہاں سے بھاگ جانے کے چکر میں پڑ جاتا اور پاپا
ہنس پڑتے۔

مگر آج یہی موسم اس کے اندر مرضیوں لگانے لگا۔ اسے یک دم ہلکی ہلکی سترنم ہنسی
کی جھنکاریں سنائی دینے لگیں اور اس نے جیسے آنکھیں موند لیں۔

بارش کو دیکھ کر وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر اس کی طرف دوڑتی تھی۔

”عمر بھائی، اف کتنا زبردست موسم ہو رہا ہے اور آپ یہ رنگ برش لے کر بیٹھے
ہیں۔“ وہ دروازہ دھاڑ سے کھول کر خراشاں چلی آئی، شاید لان سے سیدھا نہیں آئی

تھی اس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بیگلی ٹیٹس چہرے پر جھول رہی تھیں اور چہرہ
اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ دو پٹاس نے بڑے سلیقے سے جسم کے گرد پھیلا رکھا تھا۔
”ہاں میں انجوائے ہی کر رہا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا تو وہ منہ بنا کر
”ہنسی تھی۔“

”کرے میں بند بارش کو انجوائے کر رہے ہیں آپ۔ جناب باہر نکل کر دیکھئے
کیا زبردست موسم ہو رہا ہے آئیں نا۔ فہد بھی لان میں بیٹھا کبابوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہے
اس سے پہلے کہ وہ سب چٹ کر جائے جلدی سے آجائیے۔“
”کباب کھانا چاہ رہی ہو یا بارش دکھانا؟“

وہ کھیا کر ہنس پڑی، اور اس کے ہاتھ سے برش چھینتے ہوئے بولی۔
”یہ تصویر دھوپ میں بھی بن سکتی ہے۔ بارش ختم ہوگئی تو پھر مزہ نہیں آئے گا۔“ وہ
اس کے رنگ برش خود ہی ایک طرف رکھنے لگی پھر ایزل پر پردہ گرا دیا۔ وہ ہونٹ ہنسنے اسے
دیکھتا رہ گیا۔

وہ اس کی معصوم خواہشوں کا اگر کبھی احترام کر لیتا تو وہ بچوں کی طرح مسرور ہو جاتی۔
اس کی ذرا سی توجہ اس کے اندر پھول کھلا دیتی۔
اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھتا۔

کوئی موسم بھی ہو وہ اس کے بناء انجوائے نہیں کر سکتی تھی۔ مگر آج.....
اس نے لان میں برسنے والی بوندوں کو دیکھا تو جیسے باہر کا سناٹا اندر تک اتر گیا۔
آج وہ کیوں دڑ کر نہیں آئی اسے بلانے کو؟

”عمر! بارش ہو رہی ہے اور آپ اندر گھسے بیٹھے ہیں۔ آئیں نا باہر۔ دیکھیں موسم
کتنا زبردست ہو رہا ہے آئیں پلیز۔“

فہد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ایک طرح سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک گہری سانس بھر کر اس کے بیڈ کی شفاف چادر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں پولا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا عمر۔ عینہ کے ساتھ۔“

عمر نے نگاہیں ہٹا کر بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا پھر نگاہوں کا زاویہ بدل کر سامنے کی دیوار کو گھورتا رہ گیا۔

اور دروازے کے باہر دھیرے دھیرے قدموں سے چلنے والی عینہ کے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔ وہ ایسے کے پر زور اصرار پر تیز رو آلائی تھی۔ اس ستم گرد کو دیکھنے کو گھر فہد کی آواز اور اپنے نام پر ٹھٹک گئی۔

اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اندر یکفخت چھا جانے والی خاموشی اس کے اعصاب پر ضرب کی طرح لگنے لگی۔ وہ کچھ اور قریب ہو کر دروازے سے لگ کر عمر کی آواز کی منتظر ہو گئی۔

کئی بل خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔

عمر کے چہرے پر کھنکھار کی سی کیفیت سم آئی تھی۔

”اگر یہ باضی کے حوالے سے کوئی انتقامی کارروائی ہے تو.....“ فہد نے کہنا ہی چاہا کہ وہ ٹوک گیا۔

”شٹ اپ۔“ اس نے فہد کو سخت فہمائشی نظروں سے دیکھا تھا۔

”تم سب مجھے ہی کیوں بلیم کر رہے ہو۔ کیا جانتے ہو تم۔ صرف یہ کہ عینہ نے مجھے

بند کیا اور میں نے اسے ری جیکٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ کیا جانتے ہو تم؟“ اس کی آنکھوں

وہ یک دم چونکا۔

دروازہ ہلکے سے کھلتا تھا اور اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

”کمال ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ان کے کسی گشتے میں اس خوش گوار موسم کو انجوائے کر رہے ہو گے مگر یہاں تو.....“

فہد اندر آچکا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور دوبارہ رخ کھڑکی کی سمت کر لیا۔

ایک اکیدا میں ہی گھر میں خوف زدہ سا بیٹھا تھا وہ نہ شہر تو بھیگ رہا تھا۔ پہلی پہلی بارش میں ”وہ خوشی سے منگنا۔“

”آج موسم واقعی اچھا ہے۔“ وہ گہری سانس بھر کر رخ موڑ کر فہد کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمہیں لگ رہا ہے؟“ جواباً وہ ہولے سے ہنس کر ایک ابرو جھکا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے لہجے اور نگاہوں کے زاویوں سے وہ شیشا گیا پھر کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ کی سائڈ سے پڑے صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

فہد اسے نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا دھیرے سے بولا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“

وہ چونکا۔ ”کیا؟“

کہ تمہیں یہ موسم واقعی اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ اس کے سامنے اس کے بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہاں سے اس کے دل کے اندر جھانک رہا ہو۔

وہ شاید اس غیر متوقع صورت حال کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ فہد کی نظروں میں چھپے سوالوں کو یک دم نظر انداز کر دیا۔

میں سرخی لدا آئی۔ یوں بھی وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ اس کے اعصاب مثل ہو رہے تھے اور ذہن کی رنگیں تتی تتی سی محسوس ہونے لگی تھیں۔ فہد نے اسے بھڑکا ہی دیا تھا۔ اس کی طنائیں کھینچ لی تھیں۔

”میں کسی سے پسند کرنے کا حق نہیں جھین سکتا تھا“ اس کا دل نہیں بدل سکتا تھا اس کے احساسات اور جذبات میرے کنٹرول میں نہیں تھے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں کترالیں۔ فہد کچھ ایسی مہمتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا پھر ذرا سا ہنسنا۔ اس کی ہنسی بھی استہزائیہ تھی۔

”بے شک وہ جذباتی اور پاگل سی لڑکی ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے عمر کہ ہمیں اس کی دیوانگی کا اندازہ ہو گیا اور تم بے خبر رہے۔ یہاں تک کہ وہ اسی بچ پر آگئی کہ واپس پلٹنے کا راستہ گم کر بیٹھی۔“

وہ کھڑکی سے باہر پھیلی دھند کو گھورتا رہ گیا کہ فہد مزید گویا ہوا۔

”تم اسے ضرورت سے زیادہ توجہ دینے لگے تھے اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا احترام کرنے لگے تھے۔ اس کی خوشیوں کو شیر کرنے لگے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کس جذبے اور کسی رشتے سے تمہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ تمہاری دائمی رفاقت کی طلب گار تھی یہ بات میں محسوس کر چکا تھا تو تم..... تم کیسے نہیں کر سکتے تھے۔“

”چپ ہو جاؤ فہد چپ ہو جاؤ“ اس کی رگ رگ میں آگ بھڑکنے لگی۔ اس نے زور سے کھڑکی کا پت بند کیا اور چورنگا ہوں سے فہد کو دیکھنے لگا جو متا فغان نظروں سے گویا اسے چھید رہا تھا شاید اسے بھی عمر جیسے شخص سے اس طرح کے بی ہودگی توقع نہیں تھی۔

تب اس نے ایک گہری سانس بھر کر اپنے اندر سے اٹھتے اہال کر دیا تے ہوئے بانوں میں انگلیاں پھنسا کر صوفے کی پشت سے سرنگایا۔

”ہاں میں سب جانتا تھا“ میں نے خبر نہیں تھا بلکہ میں نے یہ سب جانتے بوجھتے ہی کیا ہے۔ اس کے واپسی کے راستے گم کینے میں اور یہ سب میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے کسی جذباتی لگاؤ کے تحت نہیں۔“

”عمر“ فہد قیر آئیز بے یقینی سے اسے متکارتہ گیا اس نے ہونٹ یک بارگی کٹے پھر اس نے ہونٹ کھٹوتے ہوئے سخت متاسفانہ لہجے میں کہا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ وہ ہلکے سے ہنسائے مگر اس کی ہنسی روح سے خالی تھی آنکھیں ایک لمحے کو موند کر کھلیں تو ان میں نفرت آئیز تکی الہی محسوس ہونے لگی۔

وہ اتنا اجڑا اور ویران دکھائی دینے لگا کہ فہد کے دل پر چوٹ سی پڑی تاہم وہ اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

کمرے میں چند لمحے بوجھل سا سکوت چھایا رہا پھر اس سکوت کو عمر کی آواز نے ہی چیرا تھا۔

”انا اور عزت پر لگنے والی چوٹ کچھ ایسی ہوتی ہے فہد کہ اس کی اذیت اس کی تملہائیں روح کو چھید کر بے قرار اور بے چین کر دیتی ہیں۔ میرے کردار پر کچھ اچھائی لگنی میرے ضبط کی وہ انتہائی تھی اور اس میں جس اذیت سے گزرتا تھا یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میرے سارے جذبے ساری اچھائیاں بدصورتی میں بدل گئیں۔ میرے صاف ستھرے ذہن و دل میں گندگی اندلی گئی دانستہ ایسا کیا جانتے بوجھتے میرے عمل کو آ زمایا گیا فہد میرے اندر کے مقفل مزاج انسان کو منتقم بنا دیا گیا۔ شرہ پھوپھو لگا دیا گیا الزام میری رگ رگ میں نفرت بھر کیا مجھے انسان سے شیطان کا روپ دھار لینے پر مجبور کر دیا اور آگ شرہ پھوپھو نے میرے اندر بھردی تھی میں نے اس آگ کو انتقام کی پھوار سے ٹھنڈا کرنے کی

”کوشش کی۔“

فیداس انکشاف پر بھونچکا رہ گیا۔

”انہوں نے الزام لگایا کہ میں ان کی معصوم بیٹی کو درغلا رہا ہوں۔ اسے فریب کے جال میں قید کر رہا ہوں اس کی معصومیت کا فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب پورا کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہ میں اس سے دور ہوں اور میں جو اس کی بیٹی کو کبھی اس نظر سے نہ دیکھا تھا وہ میری نظر میں ایک پاگل سی معصوم سی بچی کی طرح تھی اسی الزام نے میرے ضبط میں میرے پاکیزہ جذبوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ میں ماضی کو فراموش کر چکا تھا مگر حال کا الزام میری برداشت سے بہت زیادہ تھا میرے عمل کو ریزہ ریزہ کر دینے کیلئے کافی تھا۔“

وہ چپ ہوا تو کمرے میں یلکھت بھیاکت خاموشی چھا گئی۔

فید کے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اس کی قوت گویائی اس اندوہ ناک انکشاف نے سلب کر لی تھی۔ عمر اپنی تلکٹی کنڈیوں پر انگلیاں دبا کر آنکھیں موند چکا تھا اس کا دل نئے سرے سے انوکھی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور پردہ کھینچا مگر راہداری میں گہرا سکوت تھا۔ مگر اسے محسوس ہوا جیسے کوئی بہت سرعت سے راہداری عبور کر گیا ہو۔ وہ پلٹا تو فید نے مستفہامیہ لگا ہوں سے دیکھا مگر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر دوبارہ صوفے پر گر گیا۔

”عمر! بے شک جو ہوا یہ نہیں ہونا چاہئے تھا تاہم....“ وہ گہری سانس بھر کر دم بھر کور کا پھرا سے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ سب کرنے کے بعد تمہارے اندر کی تپش ختم ہو گئی؟ تمہاری اتنا تسکین مل گئی ہے؟“

اس کا حملہ بڑا اچانک لگا وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا دل سخت قسم کی دل گرفتگی محسوس کرنے لگا۔

”اگر طمانیت مل جاتی تو تم اتنے مضطرب.....“

”پلیز فید۔ مجھے تنہا درشت تھا۔ مگر فید بات ہی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

”اگر انتقام لینے کے بعد تم خوش ہوتے تو میں بھی بہل جاتا مگر عمر! ایسا نہیں ہے۔

تم اپنے اندر کو ٹولو شاید تم بھی انتقام نے میں اس راہ پر چلے آئے ہو۔“

”کارڈ سیک فید۔ میں نے کہا تھا مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں یہ باب بند کر چکا ہوں۔

میں بہت مطمئن ہوں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو جائے مگر ابھی ایسا نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات پر ہلکے سے ہنسا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”انا کی جنگ میں جیتنے والے

نا آسودگی کے جال میں بکڑے نہیں رہتے۔

اس طرح بے سکون مضطرب نہیں رہتے۔

وہ اس کے صوفے سے اٹھنے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا مگر اس کے ارد گرد

وہی آگ بھڑکا گیا جس میں وہ کئی دنوں سے جل رہا تھا۔



اس نے تیور دلا سے اپنے گھر تک کا فاصلہ یوں طے کیا جیسے ہزار کانٹوں سے

الجستی آئی ہو۔ کتنی محرومیوں کو سمیٹ کر لائی ہو سکتا تھا۔“

کائنات بھری گرفتگی اور آرزو دہنگی کا بو جھلے کر پہنچی ہو یہاں۔

وہ تو اس تم گرو کو دیکھنے انگلوں کے ساتھ گئی تھی۔ اسے تو وہ بے گناہ بے تقصیر ہی لگا

تھا مگر اب اس انکشاف نے اس کی ساری خوش فہمیوں کو اس بری طرح روند ڈالا کہ وہ مفلوج

پرندے کی طرح ڈھلے گئی۔

اس کا دل چاہا وہ چیخ کر اتار دے اتار دے کہ دم نکل جائے۔

سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ اعصاب دکھنے لگے کہ ”اے محض انتقام کی بھیجی کا ایندھن سمجھا گیا۔

اس کے معصوم بے غرض جذبوں کو چارے کے طور پر استعمال کیا گا۔ اس کے جذبوں سے کھیل کر درپردہ اس کی ماں سے انتقام لیا جاتا رہا۔ اس شخص کی توجہ۔

اس کی محبت۔

سب جھوٹی تھی محض ڈراما۔

شدت کرب سے کٹن اٹھا اٹھا کر دیوار پر پھینکنے لگی۔ اسے آج اپنا آپ اندر سے

بالکل خالی خالی اور دوران لگ رہا تھا۔

سب کچھ ایک بے درد ظالم سفاک شخص پر لڑا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ چند خوش گوار لمحوں کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

جو انگارے اس شخص نے برساتے تھے اس سے اس کی روح شاید عمر بھر سلگتی رہے

گی۔

اس نے تکیہ اٹھایا پھر اس پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے لگی۔

کاش..... کاش! عمر میں تمہارے فریب کے جال میں نہ آتی۔

تمہارے اندر کے شیطان کو پہلے ہی جان گئی ہوتی۔ کتنی بے مایا بے حقیقت ہو کر رہ گئی میری ذات تم نے اسے صرف اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔

میرے پاکیزہ بے غرض جذبوں کو اپنی نفرت اور انتقام کی جھینٹ چڑھا دیا۔

امی کو نینا کھانے کے لئے تم خود بھی پستی میں اتر گئے۔

تم، ”عمر“ اتنی پستی میں بھی اتر سکتے تھے میں کیسے یقین کر لوں۔

اس نے سلگتی آنکھیں کھولیں پھر موند لیں۔

اسے اپنا دل آگ میں دھڑا دھڑا جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسے لگا کسی نے اسے بہت اونچائی سے نیچے پھینک دیا ہو۔

سارا بدن پتھر پتھر کی زمین پر گر کر زخمی ہو گیا ہو۔ اب کے بتا سکے گی کہ جسے خوشی کی تھی سب کچھ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی ستارہ سمجھ کر اس کی طلب گار بن بیٹھی تھی۔ وہ تو دہکتا ہوا انگارہ نکلا جو اس کی زندگی کو بھسم کر گیا۔

اسے عمر بھر کے لئے ذلت کی آگ میں دھکیل گیا۔



چھپ، چھپ کر کئی دن رونے کے بعد اس کے آنسو حقیقتاً خشک ہو گئے تھے۔

وہ ایسی اجڑی دکھائی دینے لگی تھی جیسے بھری بہار میں ہنستے مسکراتے پودے پر خزاں آگئی ہو۔

تاہم وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو ڈھارس دے رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا کہ عمر کا اصلی روپ اس نے دیکھ لیا کم از کم اب وہ جی بھر کر اپنے انتخاب پر پچھتا تو سکے گی۔

آس و امید کا دامن چھوٹ جائے، نامرادی اور ناامیدی کی تاریکی دبیز ہو جائے تو پھر انسان ایک دن بہل جاتا ہے۔ اندھیرے کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ مانوس ہو جاتا ہے اس اندھیرے سے۔ اس تیرگی سے۔

ڈوبتی ناؤ سے اچھا ہے ڈوب جانا۔ کم از کم ڈوب جانے کے خوف اور دھڑکے سے نجات تو مل جاتی ہے۔

اس کرب انگیز اور اہانت آمیز انکشاف نے اس کی ساری خوشیوں کو یوں چوس لیا تھا جیسے آکاس بیل ہرے بھرے درخت کا پتا چتا چوس لیتی ہے۔ اسے اب اس سے

سر وہ کا نہیں تھا کہ اس کی زندگی کس طرح اور کیسے گزرے گی۔ اس نے امی کی گود میں سر رکھ کر بڑے تحمل سے کہہ دیا تھا کہ

”امی! مجھے آپ لوگوں کی خواہش منظور ہے۔ میں فہد کا رشتہ قبول کرتی ہوں۔
خمن آئی سے میں شرمندہ ہوں اور آپ سے بھی..... اور شاید اپنے آپ سے بھی۔“
شرمہ نے تڑپ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر بے اختیار اسے سینے سے لگا کر بچھڑ گیا۔

دو آنسو ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر اس کے گھٹے ریشمی بالوں میں جذب ہو گئے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی خاموش نگاہوں اور چہرے کے تاثر نے کچھ کہنے سے باز رکھا۔ وہ اس کے سینے سے الگ ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

روڈ پر ایسی تھکن تھی جو اس کا خیال تھا اب تا عمر نہ اتر سکے گی۔
اس نے کھڑکی کے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھا اور گہری سانس بھر کر کھڑکی کے شیشے سے لگ کر اندھیرے کو گھورنے لگی۔

وہ جس کو پیار کا مفہوم تک نہیں معلوم

اس کے در پہ ہی کیوں جان و دل لٹا بیٹھے
ہماری طرح سے اجڑا ہے کون زمانے میں
نہ تو ملا ہمیں، خود کو بھی ہم گنوا بیٹھے



وہ ابھی آفس سے اٹھنے ہی والا تھا کہ فہد اندر داخل ہوا اور سیدھا اس کی میز تک آیا اور دونوں ہاتھ میز کی سطح پر نکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے اس انداز پر وہ ذرا سا چونکا۔

”خیریت... کوئی کام تھا کیا؟“ اس کی آمد اس کے لئے غیر متوقع ہی تھی۔ وہ بہت کم ضرورتاً ہی آفس آتا تھا۔ اس کے استفسار پر سر کو ہلکی سی اٹھاتی جنبش دی پھر ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔

”ایک خبر سنائی تھی اسے خوش خبری سمجھ لو..... یا“
وہ پل بھر کو اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے بولا۔ ”اصولاً تو مجھے مضامی کے ہمراہ آنا چاہئے تھا مگر خیر مضامی تم گھر پر آ کر کھا لینا خبر مجھ سے سن لو کہ عینیہ کے ساتھ میرا رشتہ طے پا چکا ہے اور اس آنے والے جمعہ کو منگنی ہے۔“

اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا دوسرے پل نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

فہد یہ خبر سن کر اب اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

”تم نے غالباً کہا تھا کہ فہد کی خوشی میں اس کو سب سے پہلے گلے لگانے والا میں ہی ہوں گا۔ فہد کے لبوں کی تراش میں دھیمی سمرات تھی نگاہیں اب بھی اس کے چہرے پر جمی تھیں پھر وہ پیچہ ویت گھماتے ہوئے بولا۔

”تمہیں یقیناً مسرت ہوئی ہوگی۔“

اس کا دل چاہا وہ فہد کو فوراً کمرے سے باہر کر دے اور خود آنکھیں موند کر سر میں یک دم اٹھنے والے درو کو دبانے کی کوشش کرے۔ مگر بس وہ فہد پر تر بھی نگاہ ڈال کر رہ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

”تم خوش ہو اس سے اچھی بات میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ بھائی ہو میرے تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔“

اس کے چہرے پر اب ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ حملہ بے شک اچانک تھا مگر اس کی قوت ارادی بھی بلا کی تھی۔

میں اس کا ہونے نہیں سکتا اسے ہونے نہیں دیتا

فہد نے کچھ ایسی ہنسی کے ساتھ ہر جستہ کہا کہ وہ ہونٹ بھیجنے اے بس دیکھتا رہ گیا۔ پھر خاموشی سے پلٹ کر آفس سے نکل کر لکھن کی طرف بڑھ گیا۔ فہد بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”مسٹر عرا! کسی سیانے نے کہا ہے کہ ”آپ چند لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنا سکتے ہیں اور بعض لوگوں کو بعض وقت، مگر تمام لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنا سکتے اور سنو پلیز۔“ وہ چنچتارہ گیا مگر۔

مگر وہ بڑی سرعت سے بٹن پش کر دیا گیا تھا اور دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا جب کہ باہر رہ جانے والا فہد مضطرب بھیج کر رہ گیا۔



وہ سی گرین کا مدانی سوٹ میں فہد کے برابر بیٹھی تھی جب وہ لڑکیوں اور لڑکوں کے جھوم کم ہونے کے بعد مبارک باد دینے اسٹیج پر آیا تھا۔ فہد کو اس نے گلے سے لگا کر مبارک باد دی۔ فہد اسے شاک کی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ مگر وہ انجان بنا عینہ امر کی طرف چلا آیا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“ اس نے بو کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بڑے سے ٹشو کے دوپٹے میں تقریباً ادھا چہرہ چھپانے بیٹھی تھی۔ یوں جیسے پتھر کی صورت ہو۔ حزن کی آمیزش نے اس کے چہرے کو اور بھی دل کش بنا دیا تھا۔ مگر اس کا حزن تو صرف محسوس کرنے والی آنکھ ہی محسوس کر رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھی مگر تو اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ وہ ضبط کے نہ جانے کتنے سمندر پار درک کے یہاں بیٹھی ہے ایک آتش فشاں دبائے۔

فہد دل ہی دل میں اس کے اعصاب کو سراپے بغیر نہ رہ سکا۔

مگر وہ لمحہ جو اس کے اعصاب کو لکھ بھر کے لئے ہی سہی منتشر کر گیا تھا۔ اضطرابی کیفیت کا لمحہ اسے فہد کے سامنے طشت از باہر کم چکا تھا۔ وہ اسے بڑی کھوجتی اور قدرے تسمخہ زانہ نگاہوں سے نکتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”یقیناً میری خوشی تمہاری خوشی ہے۔ تم ہمیشہ سے فراغ دل رہے ہو۔ اپنی چیزیں بڑی خوشی سے میری جھولی میں ڈالتے رہے ہو۔ یاد ہے مجھے اچھی طرح، جب بچپن میں، میں تمہاری چیزوں پر حق جتایا کرتا تھا تو تم، بڑی محبت سے مجھے بہلانے کی خاطر اپنی قیمتی اشیاء بھی مجھے دے دیا کرتے تھے مجھ سے میرا دل رکھنے کو..... دادی ڈانٹتی کہ.....“

”پلیز فہد۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی اس گراس کی اٹھتی نگاہوں میں جانے کیا تھا وہ نگاہوں کا زاویہ بدلنے پر مجبور ہو گیا اور قدرے پست آواز میں بولا۔

”اس بے مقصد گفتگو کا مقصد؟“ وہ کرسی جھکیں کر کھڑا ہو گیا۔

فہد اسے بڑی دل گرفتگی سے دیکھنے لگا پھر ایک گہری سانس بھر کر سیدھا ہو گیا اور اس کے ہمراہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”اس بے مقصد گفتگو کا مقصد تھا بلکہ تمہیں سمجھانا کہ ہر وقت کی فیاضی اور فراخ دلی اچھی نہیں یہ کبھی کبھی عر بھر کیلئے اذیت بن جاتی ہے۔ انسان چیز نہیں ہوتے کھلو نے نہیں ہوتے، محبت بہت قیمتی شے ہے یہ کسی کو تھد میں بھی نہیں دی جاسکتی۔ چاہت سے کوئی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ دل میں رہتی آبلے کی طرح سلگتے پھوڑے کی طرح۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے نکلتے کندھے اچھک کر بولا۔ مگر فہد نے کچھ ایسی نظروں سے اسے گھورا کہ اس نے نگاہیں چرا لیں۔

میں اپنی انا کے ہاتھوں عجب بے بس ہوں یارو

عمر چند لمبے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے چاہنے کے باوجود نگاہیں نہ ہٹا سکا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے بو کے پلٹے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ نگاہوں کا تصادم ہوا۔ ان نگاہوں میں جانے کیا تھا اسے اپنے دل پر نامانوس سی آنچ پتی محسوس ہونے لگی۔ ایک دم اپنے اندر غالی پن کا احساس ہونے لگا۔ سب کھودینے کا اذیت ناک احساس روح پر کچھ کے لگنے لگا۔ اضطراب رگ رگ کو چمیدنے لگا۔ وہ بو کے لئے کڑھنک پوکھ کر پھر جھسی آواز مگر بڑے جیسے لہجے میں بولی۔

”کیا یہ اہلی پھول ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے لوکے ناک پر لے جا کر سوگھا۔

”خوشبو مصنوعی پھولوں سے بھی کبھی کبھار آ جاتی ہے کہ انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی دھوکا ہی نہ ہو۔“

اس کا مطلب تھا اس روز اس کے کمرے کے باہر جو کھڑکا ہوا تھا تو وہی تھی اور فہد سے ہونے والی گفتگو سن چکی تھی۔ ایک کرب اس کے دل کے اندر سرایت کر گیا۔ اسے لگا اس کا دل دکھ کی نامعلوم پاتال میں اترتا جا رہا ہو۔

گھر آ تو خالی پن اور شکست خوردگی کا احساس رگ رگ سے اندر ہاتھا۔ اس نے جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

اسے تو کھو ہی چکے پھر خیال کیا اس کا یہ فکر کسی کہ اب ہو گا حال کیا اس کا وہ ایک شخص جسے خود ہی چھوڑ بیٹھے تھے کھلائے دیتا ہے ملال کیا اس کا



فہد کے لندن جانے کی تاریخ آچکی تھی۔ وہ اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ”تیو رولا“ میں اس کے جانے والے لوگ سب ہی جمع تھے۔ ہلکی پھلکی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شمن نے عید کو صبح سے ہی بلوایا تھا۔ وہ ان کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ فہد کی شرارتوں کی زد میں بھی تھی۔ فہد خوب چلبلا ہو رہا تھا۔ اس کی ویرینہ اور دلی آرزو جو پوری ہوئی تھی۔ سب نے ہی محسوس کیا اتنا خوش تو وہ اپنی جھٹکی والے روز بھی نہیں تھا۔

وہ اماں جان کے کمرے میں بیٹھی تھی تب عمر اندر داخل ہوا تھا۔

”شکر ہے جناب کی صورت تو نظر آئی۔“ فہد اسے دیکھ کر چپکا۔ وہ دروازے پر ایک بل رکھا تھا۔ وہ اماں کے پہلو میں بیٹھی اس کی آمد پر بے آرا می کی کیفیت میں کھڑی ہو گئی تھی۔

”دادا کہتی ہیں عمر تو عید کا چاند ہے مگر بھائی میرے عید کا چاند بھی سال میں ایک

ایک افراد ہی مسکرا ہٹ کے ساتھ وہ بو کے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

فہد نکسری دونوں سے بے نیاز ہو کر اپنے دوست سے جو گفتگو کرتا تھا۔

عمر اس کی بات پر غصہ کیا۔ بے اختیار ہی اس کی طرف رخ موڑ کر دیکھا تھا۔

اصحاب کو خفیف سا جھٹکا لگا تھا۔ اس کے چہرے سے تاثرات نے اس کی پیشانی کو پتا دیا جیسے کوڑ کا تھپیر اسے چھو گیا ہو۔

”آپ تو یوں بھی خوب صورت دھو کے باز ہیں۔“ وہ بھاری خوش نما پلکوں کو اٹھا کر ایک ہلکی مگر جھٹکی مسکرا ہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کر بولی۔

وہ ایک دم ہونٹ بھیج کر گرہ گیا۔ یہ کوئی موقع نہیں تھا جواب دینے کا اور یوں بھی اس کا ذہن فوری طور پر اپنی مداخلت کے لئے الفاظ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ذہنی جھٹکا ضرور لگا تھا وہ اسٹیج سے تیزی سے اتر گیا۔

بارنظر آئی جاتا ہے۔“ وہ اسے پھینچنے کی غرض سے بولا۔ وہ مسکرا کر اندر آ گیا اور ایک دھپ اس کے کندھے پر جمادی۔

”اب اتنی بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور سنو میں نے کچھ ٹراؤز خریدی ہیں تمہارے بیڈ پر رکھ آیا ہوں اور تمہاری جیکٹ بھی آچکی ہے۔ کپڑوں کی پیکنگ خیال سے کرنا وہاں سردیاں بہت ہوتی ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”عینیہ!“ فہد نے یک دم اس کی طرف رخ موڑا تھا اور اس پر ترش سی نظریں ڈالتے ہوئے اور دبی زبان میں مگر تحکم بھرے لہجے میں بولا۔

”بیٹھ جاؤ، کہاں جا رہی ہو؟“

اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ فہد اسے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھ کر یوں یک دم ڈانٹ دے گا۔ خفت کے ساتھ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

عمر نے بس ایک نظر اس کے لال رنگ چہرے پر ڈالی اور فہد کی طرف متوجہ ہو گیا جو کہہ رہا تھا۔

”مجھے تو سی آف کرنے کے لئے لگتا ہے امی نے پورا محلہ اکٹھا کیا ہوا ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں یہ بجوم بیکراں انرپورٹ پر دہشت گردی کے الزام میں دھریا نہ جائے۔“

عمر اس کی بات پر ہلکے سے مسکرا دیا۔ پھر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

”لو تم کہاں چلے؟“ اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”آپ باتیں کریں۔ مجھے ایک دو کام نہ مانے ہیں۔“ وہ عینیہ کے جھکے سر پر ایک ٹکڑا ڈال کر ٹراؤزری کیسیوں۔ ہاتھ پھنسا کر پلٹ گیا۔

”جی ہاں کام تو سارے آپ ہی کرتے ہیں، ہم تو باتیں ہی بگھارتے ہیں۔“

”اس میں کوئی شک بھی نہیں۔“ وہ پلٹ کر مسکرا دیا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

فہد نے پلٹے پردے سے نگاہیں ہٹا کر بے اختیار اندنگہ عینیہ پر ڈالی جو تپتے تپتے چہرے کے ساتھ سر جھکا کر لبوں کا گوشہ دانتوں میں دبائے بیٹھی تھی گویا عمر کی موجودگی نے اس کے دل کے تاروں کو پھینچا تھا۔ فہد کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بے مقصد مسکرا نے لگی۔



فہد چلا گیا ”تیوورولا“ میں خاموشیاں اتر آئیں۔ اس نے جاتے ہی فون اپنی خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔ مگر اس کے بعد مبینہ بھر ہو چلا اس کا نہ دوبارہ فون آیا نہ کوئی اطلاع ملی۔ عمر نے کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بات ہی نہ ہو سکی۔ پھر چند دن مزید گزرے کہ اس کا خط موصول ہوا۔ خط کیا تھا ہم ہی تھا جو تیوورولا اور احمد ہاؤس میں مشترکہ طور پر پینا تھا۔

اس نے خط میں اپنی منگنی کی اطلاع فراہم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”اس نے عینیہ سے رشتہ ختم کر دیا ہے اور وہاں لیزا نامی لڑکی سے منگنی کر لی ہے۔“ لڑکی کے اس نے خوب قصیدے لکھے تھے اور مزید لکھا تھا کہ وہ شادی بہت جلد کرنے والا ہے۔

ٹھن تو پھوٹ پھوٹ کر روئی مگر اسے دلا سا دینے والا کوئی نہیں تھا سب کے دل فہد کی اس حرکت پر غم سے نڈھال تھے۔

عمر اس خبر پر خاصا متعجب ہوا تھا۔ اسے فہد سے اس رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ تاہم اسے گھر والوں اور فہد کی فکر کی بجائے عینیہ کی فکر ستانے لگی۔

وہ پہلے ہی اس کے دیے ہوئے زخموں سے چور چور تھی، اس نئی افتادہ پردہ نازک سی لڑکی ٹوٹ پھوٹ ہی نہ جائے۔ اس کا دل چاہا وہ انڈر اس کے پاس پہنچ جائے اپنی اس

کیفیت پر وہ خود بھی حیران ہو کر رہ گیا۔

دوسرے دن وہ احمر ہاؤس آیا تو شمرہ اس سے لگ کر بچوں کی طرح رودی۔

”مجھے تو میرے کیے کی سزا ملی ہے عمر۔ مگر میری بچی کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟“ شمرہ کے اس طرح بلک بلک کر رونے پر وہ پریشان ہو گیا۔

”مجھے معاف کر دو عمر۔“

”پھوپھو پلینز۔ ایسے تو مت کریں۔“ اس کا دل رنج سے شق ہونے لگا۔ وہ انہیں

تمام کرصوفے پر بٹھا کر ٹھٹھا پانی پلانے لگا۔

”فہد نے ایسا کیوں کیا عمر؟“

”حوصلہ کریں پھوپھو۔ میں خود جاؤں گا اس کے پاس اور اس سے باز پرس کروں

گا۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ عینہ کے ساتھ۔“ بولتے بولتے اس کی زبان ٹھٹھری گئی وہ لاؤ رنج کے دروازے کے پاس کھڑی استہزیاء آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے بس ایک نظرا سے دیکھا اور جلدی سے نگاہوں کا زادیہ بدل کر شمرہ کے کندھے کو تھپتھپانے لگا۔

وہ دروازے سے ہی پلٹ گئی تھی مگر اسے اندر باہر سے تہہ وبالا لگ گئی۔

وہ آہستگی سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو وہ جھکی اپنی رائٹنگ ٹیبل کی دروازے سے جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ٹھٹھراؤ سا تھا جو اسے لگا جیسے یہ استقامت کی نہیں غصے اور خود آزاری کی کوئی کیفیت ہو۔

شدت غم شاید یونہی زہر بن جاتا ہے۔

کھٹکے پر اس نے چہرہ اٹھایا تو اسے دیکھ کر اس کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔ وہ پہلے

والی عینہ نہیں بلکہ ایک مختلف عینہ نظر آ رہی تھی جس کی بس نرس میں زہر ہو۔ آنکھوں میں نفرت کی تپش تھی۔

”کیوں آئے ہو یہاں؟ ہم رومی کرنے تمہاریاں دینے آئو پونچھئے۔ تو سوری میری آنسو تو اس روز سے خشک ہو گئے تھے۔ جب دل میں نے پہلا دھوکا کھایا۔ فہد کا یہ رویہ میرے لئے کسی رنج و غم کا باعث نہیں بنا۔“

وہ پھٹ پڑی۔ عمر فوری طور پر کسی طرح کا رد عمل ظاہر نہ کر سکا۔

وہ دراز کھٹاک سے بند کر کے سرخ چہرے کے ساتھ خود ہی اس کی جانب بڑھی اور

اس سے کچھ فاصلے پر کمرے کے اس کے چہرے پر نگاہیں ڈال کر متفرجہ جیسے میں بولی۔

”مجھے فہد سے کوئی شکوہ نہیں ہے نہ میں اس آنسو بہاؤں گی بلکہ میں تو خوش ہوں کہ مجھے کسی بڑے نقصان سے پہلے ہی آپ دونوں مردوں کی اصلیت کا علم ہو گیا۔“

”عینہ۔“ اس نے کچھ کہہ کر چاہا کہ وہ رنج موڑ کر بالکل افسردہ منی کے ساتھ بولی۔

”ہاں، دکھ اس بات کا ہے کہ جسے چھاؤں سمجھ کر اتنا طویل سفر کیا گھٹنا سنا یا سمجھاؤ تو جتنی دھوپ لگتا ہے لٹھا دینے والی۔ بھسم کر دینے والی دھوپ۔“

”عینہ پلینز۔“ اس نے تپ کر اس کا بازو پکڑا اور جھٹکے سے رنج اپنی طرف کیا تو وہ پھر گئی اور اس گرفت سے بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

”میں نے فہد کی رفاقت صرف اس لئے قبول کی تھی کہ اس میں میرے پورے گھر والوں کی رضا تھی۔ خوش تھی ورنہ میں اس رفاقت کو سراپ سمجھتی ہوں جس میں آدمی ہمہ

جاں شامل نہ ہو۔ شاید فہد جانتا تھا یہ بات اس نے بہت عقل مند کی کا فیصلہ کیا ہے اور شاید میری رہائی بھی اس میں تھی۔ ہاں آپ میری خوشی کو ضرور شینز کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

مگر میں اپنے دکھوں میں کسی کو شینز کرنا شینگی اجازت نہیں دے سکتی۔ خوشی میں تو

کھویا ہو تو پھر بے سکونی اور اضطراب زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میں بھی ایسی ہی اذیت اور بے سکونی میں گرفتار ہوں عینہ۔ میری طرف دیکھو تمہیں دکھ دیکر ایک پل بھی سکون سے سو یا نہیں ہوں۔“

”جھوٹ بولتے ہیں آپ۔“ وہ چلائی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔

وہ لب بچھنے اذیت آمیز احساس کے ساتھ اسے دیکھتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔



تمام عمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسار ہے

اسے نئے سرے سے اپنے جرم کا احساس ستانے لگا تھا اور ایک بار پھر دل تمام تر شدتوں سے عینہ امر کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسے لگا قدرت کی طرف سے اسے موقع ملا ہو۔ اپنے کیے کی تلافی کا، اس کو پالینے کا۔ مگر وہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی بلکہ کسی کی بھی بات سننے کو تیار نہ تھی اور جانے اس کی ساری انا بھی کہاں جا سوئی تھی۔ دیوانوں کی طرح وہ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

اس روز وہ کسی کام سے ”تیمور لا“ آئی تو وہ لان میں بی گھیر بیٹھا۔ اسے دیکھ کر وہ نفرت سے منہ پھیر کر جانے لگی مگر وہ بڑی سرعت سے اس کی بجائے کی راہیں مسدود کرتا ہوا اس کی راہ میں آ گیا۔

وہ بے چارگی آمیز کرب کیساتھ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں آپ میرے۔ خدا کیلئے مجھے اپنی مرضی سے جینے دیجئے۔“

غیروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے نا..... مگر آنسو صرف اپنوں کے سامنے بہائے جاتے ہیں۔ دکھ صرف انہی کے سامنے رویا جاتا ہے جو قریب ہوں اور مجھ سے صرف میرا دل قریب ہے، آپ سب بغیر ہیں میرے لئے۔“

آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ لال انگارہ ہو رہا تھا۔ آہستگی سے دوسرا آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے ستاروں کی مانند نکل کر خساروں پر گر کر ٹوٹ گئے۔

وہ پلٹنے لگی مگر عمر نے اس کے بازو پر گرفت مضبوط کر دی۔

”میں تم سے ہمدردی کرنے نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے دولفظ تمہارے کسی بھی دکھ کا مداوا نہیں ہیں۔ نہ میں معافی مانگوں گا کہ یہ بھی تمہارے کسی کام کی نہیں میں تلافی کرنا چاہتا ہوں اپنے جرم کی۔“ وہ ہل کھا کر چلی تھی۔

”میں بکاؤ مال ہوں کہ فہد نے چھوڑا تو آپ۔“
”عینہ“

”سٹ اپ۔ نکل جائیں یہاں سے۔“ اس نے جھجکا دے کر اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا اور زور سے چلائی۔

”نفرت ہے مجھے آپ سے..... چلے جائیں خدا کے لئے“ چلے جائیں۔“ میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔

”کبھی یوں ہوتا ہے عینہ امر کہ جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے اتنا پر پڑنے والی ضرب کی تھملا ہنوں کی روئی میں سستی آتی ہے تو سوچنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہیں سے نفع و نقصان سود و زیاں کا احساس ہونے لگتا ہے غصے اور جذبات کے اس طوفان میں انتقام کے سیلاب میں کیا کھویا کیا پایا۔ یہ فکرا اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور اگر کھویا ہی

”تم نے جاب کیوں کر لی ہے؟“ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولا۔ وہ سنگ گئی۔

”مصرف رہنے کے لئے..... آپ کو کوئی اعتراض؟“ اس کی بات پر اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔

”مصرف رہنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔“

”مثلاً۔“ اس کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔ کیوں یہ شخص اس کی جان پر بن آیا ہے۔ وہ تو اب اس کا چہرہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی بلکہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ جانا چاہتی تھی مگر یہ شخص ہر بار نئے سرے سے اسے اسی اذیت ناک دنیا میں کھینچ کر لے آتا تو وہ خود کو بھی بھول جانا چاہتی تھی مگر وہ اسے اپنے وجود کی موجودگی کا احساس دلانے جا رہا تھا۔

”مثلاً میرے بارے میں سوچو میرے ساتھ نئی زندگی شروع کرو۔ اتنی مصرف ہو جاؤ گی کہ.....“

’بند کریں یہ بکواس میں ایسا گھٹیا مذاق پسند نہیں کرتی۔“ وہ طیش کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی مگر وہ تو بے حد خوب صورت جذبوں کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔ وہ اذیت کے عالم میں لب بھینچ کر رہ گئی۔

اس شخص نے اس بری طرح اس کے نازک جذبوں کی کونپلوں کو نہ روندنا ہوتا تو شاید یہ محبت بھری نگاہیں اس کے اندر پھول کھلا دیتیں۔ انگ انگ مہر کا دیتیں۔ مگر وہ اب اس احقانہ اور جذباتی دور سے گزر چکی تھی۔

وہ نادانی کا دور گزار چکی تھی۔ اب کسی طرح اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسکا اعتبار بہت بری طرح توڑا گیا تھا اسے خود کو کمزور کرنے کے لئے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت تھی۔ یا وقت کی۔ مگر وہ دانستہ سمجھنے نہیں چاہتی تھی خود کو ”پائل لڑکی محبت

بڑا خوبصورت نازک مگر اتنا ہی پاورفل جذبہ ہے۔ اس کی جڑیں کبھی نہیں سوکتی یہ اندر ہی اندر پھیلتا رہتا ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ تمہاری اندر میری محبت کی جڑیں سوکھ چلی ہیں۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ دھیمہ بھاری لہجہ اس کے دل میں تیز گھونپ سمیٹا۔ اس نے بڑی چھتھی نگاہوں سے اسے دیکھا وہ اسے پسپا کرنے کے تمام ہتھیار استعمال کر رہا تھا وہ گویا رودینے کو بھی پھر یک دم اسے دھکیل کر بھاگتی ہوئی لان عبور کر گئی۔



ہمارا کیا کہ ہم بھڑے
بڑے ناداں بہت بے حس
سدا جو درد سے بوجھل
بہت وحشی بڑا خود میں
بس اپنے کرب سے واقف
کہاں فرصت کہ ہم سوچیں
کسی کے درد کو کھویں
کسی کی ہم کو کیا پروا
کسی کے غم سے کیا رشتہ
ہمارا دل نہیں رکتا
بہت طوفان جھیلے ہیں
نہ جانے کیوں مگر یہ دل
ٹھٹھک جاتا ہے بس ایک پل
کہ جب کوئی عنایت ہو

کسی بے لوث جذبے کی

منصفانہ سی عدالت ہو

پھر ایسے میں وہ ہر ایک غم

جسے ہم نے بھلایا ہے

وہ ہر چہ وہ ہر منظر

وہ سارا قرض جو باقی ہے

اچانک یاد آتا ہے

فصیل ضبط گریہ کو

گراتا ہے مٹاتا ہے

ہمارا دل نہیں رکتا

ٹھک جاتا ہے اک پل

کچھ ایسا اٹھ کر

اچانک ہم نے پایا ہے

تمہارے پیار کا جذبہ

تمہارا اک حسین تختہ

اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ گلابی کاغذ کو دکھا جو جانے کب وہ اس کے گھر آ

کر اس کے کمرے میں رکھ گیا تھا۔ اسے غصے سے چھاڑنا چاہا مگر انگلیاں کچپکا گئیں۔ اس

نے ایک بار نہیں کئی بار بلا ارادہ اس نظم کو پڑھا۔ پھر روح اور بڑھنے والی جھکن سے بے

حال ہو کر اسی پرچے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

تم بہت ظالم ہو مگر بہت ظالم آ

میں کیسے یقین کر لوں۔ کہیں یہ بھی غریب نہ ہو میرے اعتبار کو بہت روند آ گیا ہے
اب سکت نہیں ہے بار بار نکمرے کے عمل نے مجھے غم حال کرو یا ہے۔“

اسے لگا وہ اس شخص کے سامنے ایک بار پھر ہارتی چارٹی ہو۔ دل پھر تڑپاؤں کے
سیل شوق میں پہن لگا ہو۔ دلی چنگاریاں بھڑک کر شعلہ بننے لگی ہوں۔

نہیں ہرگز نہیں! میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ اتنی ارزاں نہیں ہوں میری زندگی کہ
اسے تمہارے ہاتھوں کھلوتا بنے دوں۔“

اس نے اپنے آپ کو کسی کمزور لہر کے زور سے نکالا۔ اس کی آنکھوں میں پھر
نفرت کے شعلے اٹھنے لگے مگر اندر ہی اندر وہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھسے رہی تھی اور یہ بڑی
تکلیف دہ بات تھی اس کے لئے۔



دوسری صبح ہی وہ تیمور لاہری آئی اور سیدھی اس کے کمرے میں آئی۔ وہ ابھی
نہا کر نکلا تھا تو لمبے سے کیلے بال پونچھ رہا تھا کہ اس نے وہ خوشبو میں بسا پرچہ اس کے منہ
پر دے مارا۔

”کم از کم آپ کو ایسی بچکانہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ آپ اسکول بوائے نہیں
ہیں نہ میں وہ پہلے والی امتحانی عینہ احمر ہوں۔ جو اس طرح کے کھیل سے پہل جاتی تھی۔“

وہ اس حملے کیلئے تیار نہیں تھا۔ پرچہ اس کے چہرے سے مس ہو کر اس کے قدموں
میں گر گیا۔ وہ کسی طوفان کا روپ دھارے کھڑی تھی اور واقعی پہلے والی معصوم امتحانی عینہ
احمر نہ دکھائی دے رہی تھی بلکہ اب تو سیدھی دل میں اتر جانے والی روح کو مہکانے والی

محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ مٹ آئی۔

”امتحانی تو خیر تم اب بھی ہوا در پہلے سے کہیں زیادہ دل کش اور ہوش رہا ہو گئی ہو۔“

وہ اپنے حملے کے جواب میں اس طرح کے حملے کے لئے قطعی تیار نہیں تھی۔ شینا
گئی تاہم نکمرے کے اعتماد کو کھینچتے ہوئے درجی سے بولی۔

”آئندہ آپ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔“

”کیسی حرکت؟“ وہاں وہی اطمینان تھا جو اس کے اطمینان کو غارت کرنے کو کافی تھا۔ وہ دانت چیس کر رہی اور جبکہ کروہ کا غذا اٹھا کر اس کے آگے لہراتے ہوئے بولی۔
”ایسی۔“

اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے وہ پرچہ لے لیا۔
”کیا ہے بھلا اس میں؟“ وہ ایسی نظروں سے اسے دیکھنے لگا کہ اس کی پچلیں لرز کر کھمبہ رخساروں پر جھک آئیں دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

اچانک ہم نے پایا ہے
تمہارے پیار کا جذبہ
تمہارے درد کی قیمت
تمہارا اک حسیں تختہ

اس کی بھاری آواز جذباتوں سے پر ہو کر اس کی سماعت پر برسی تھی۔ وہ پرچہ
تھا اسے دیکھنے لگا۔ دل میں پچھلے بچا دینے والی دکھائیں تھیں۔

”عینہ“ وہ تمام تر شدتوں کے ساتھ اسے پکارنے لگا۔ ”کیوں نہ ہم سب کچھ بھلا
کرنے سے اپنی زندگی شروع کریں۔ میں اپنے فعل پر سخت پشیمان ہوں۔ میں نے
یہ سب نہیں چاہا تھا اس طرح تمہیں دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس اس وقت میں
جذباتی ہو گیا تھا۔ طوفان گزر جائے تو بیٹھ کر اس کی جانیاں پر رونے کی بجائے نئے سرے
سے تعمیر شروع کرنی چاہیے۔ نئے حوصلے اور امنگوں کے ساتھ“ پھر تباہ حال زمین کو رفتی
بٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کے دل میں محشر بچا تھا اس نے کچھ کہنا چاہا کہ خود
بخود آؤ سوئل کر اس کے تپتے رخساروں پر کھمکھم آئے۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹی پھر پلٹ کر
سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ سخت دل برداشتہ سا ہو کر پلٹے پر دے کود پھٹا رہ گیا۔
مقاہمت کا تصور وہ شاید ذہن سے نکال چکی تھی۔ وہ کسی طرح اس کی خطا کو

معاف کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر وہ بھی کسی صورت اس سے دست بردار نہیں ہوتا
چاہتا تھا۔ وہ اس کی روح کا حصہ بن چکی تھی۔ مگر اسے کوئی راہ بھائی نہ دے رہے تھے۔ کسی
طرح وہ اسے قائل کرے۔ کیسے اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے جس میں اس کی
محبت بھری پڑی تھی۔

وہ سخت پڑمردگی اور دل گرفتگی محسوس کرنے لگا۔ ایک بے چارگی آمیز کرب روح
کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔



”تیورولا“ کی ساری روئیں تو دمڑ چکی تھیں۔ ایک ویرانی درد و یار سے چلتی
محسوس ہوتی۔

اماں تو اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ٹخن الگ بولائی بولائی پھر تھیں۔ کبھی عمر
کے پاس آ کر بیٹھ جاتیں جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔ فہد کی اس حرکت
نے انہیں تیورولا میں سر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ہر کوئی جیسے پشیمان پریشان دکھائی
دیتا۔

اس روز ٹخن اس کے پاس آئی اور بے اختیار ہو کر رو پڑی۔
”عمر! مجھے معاف کر دو۔ مجھے لگتا ہے ان ویرانیوں کا سبب میں ہوں۔ میرے
ضمیر پر بہت بوجھ ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دم گھٹ جائے گا۔“
وہ اس صورت حال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری
اقدام کیا کرے۔ کبھی اماں جان کمرے میں داخل ہوئیں اور ٹخن کو تمام کراپے پاس صوفے
پر بٹھالیا۔

ٹخن کو بھی یقیناً کسی ہمدرد و غم گسار کی طلب ہو رہی تھی وہ اماں کا کندھا پا کر
دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

مگر پریشان سابلوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا کمرے میں پھر کاٹنے لگا۔
”عمر! عینہ تو بلا تفسیر کے اتنے عذاب سر رہی ہے۔ اسے تم اپنا لودہ میں تاجر

خود کو معاف نہیں کر سکوں گی۔ میں غمخوار اور عینہ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں گی۔ مجھے وہ بہت عزیز ہے عمر۔ مجھے اس کی بچی خوشیاں عزیز ہیں۔“
اس نے جگ سے پانی بھر کر ان کی طرف بڑھا دیا اور پھر خود ہونٹ بھیجنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ سخت قسم کی اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ تیور دلا کی ہر آنکھ اس پر مچی ہو کر اٹھتی ایک آس لے کر جیسے اب وہی نجات دہندہ ہو۔ مگر وہ کیسے بتا کہ وہ لڑکی پھر بنی ہوئی ہے۔ اس سے اس بری طرح کبیدہ ہے۔

اتنی خود سری تو تم کسی بھی عینہ۔ یہ تم اتنی سخت دل کیسے ہو گئیں۔“ وہ پریشان ہو کر سڑکوں پر گاڑی دوڑانے لگا۔ پشیمانیات تھیں کہ بڑی جاتی تھیں۔ وہ اگر حقیقتاً خوش ہوتی وہ وہ یقیناً پیچھے ہٹ جاتا مگر وہ جانتا تھا کہ اس عینہ کو اس کے سوا کوئی نہیں سمیٹ سکے گا۔ وہ کھل اپنی انا کا خول چاڑھنے بیٹھی ہے خود پر۔ اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور وہ اسے تمام عمر سلنے کڑھنے کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

وہ گاڑی سے ٹپک لگائے کھڑا تھا اس کے اسکول کے سامنے جہاں وہ آج کل پڑھا رہی تھی۔ اسکول آف ہونے پر باہر نکلے تو اسے دیکھ کر پکڑا گیا۔ دوسرے بلی نظر انداز کرتے ہوئے سڑک کی طرف جانے لگی مگر وہ اس کے قریب آ گیا۔

”جا کہاں رہی ہو چپ چاپ گاڑی میں بیٹھو۔“ اس کا لہجہ درست تھا۔

”اس زحمت کا مقصد؟“ وہ کڑے لہجے میں بولی۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے اسے پتہ کر دیکھنے لگا۔ دل تو جا ہا ایک زمانے کا وہ تھمرا ہوا تھا اس کے منہ پر دے مارے جیج جیج وہ اسے سمجھو کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہوں نے بہر حال اتنا کیا کہ وہ بغیر جیل و جنت گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی مگر بیٹھے ہی چپٹنے لگی۔

”آپ میرا اچھا چھوڑ دیں تو میری ہانسی ہوگی۔ میں آپ کی محتاج نہیں ہوں خود آ جا سکتی ہوں۔ بلکہ میں اب کسی کی بھی محتاج ہو کر نہیں رہنا چاہتی بہت کرتی سب نے اپنی سی اب مجھ پر کوئی اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے گاڑی اشارت کر کے سڑک پر ڈال دی۔

”آپ اس طرح دھونس دیتے نہیں سکیں گے۔“

وہ غصا کر کے نظر میں بنا کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور آہستہ سے بولا۔

”جیت میرا مقدر کہاں میں تو بہت پہلے ہار گیا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ ہارنا چلا گیا۔“ اس کے لہجے میں ہلکی آج صحتی اس کی پلکیں رخساروں پر جبک گئیں وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو کھورتی رہ گئی۔

کچھ آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی تھی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”عینہ اے“ کتنی بے تائیاں تھیں لہجے میں کہ اسے اپنا دل پہلو سے کھلا محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنی دھڑکنیں رکھی محسوس ہوئیں۔ پلکیں اٹھانی چاہیں مگر لڑکر جبک گئیں۔

”میں واقعی ہار گیا ہوں اور تھک چکا ہوں خود سے لڑنے لڑنے اور جی تو یہ ہے کہ اب تمہیں کھودینے کا راز بھی نہیں ہے۔“ وہ اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایک دم اپنا سر اسٹیرنگ وکیل پر جھکا گیا۔ اس کا لہجہ بے حد ملو کا پھوٹا تھا۔

”میں نے زندگی کو بڑے مختلف انداز میں برتا ہے مجھ میں بھی ہر راہ ہیں مگر نفرتوں کی شدتوں نے مجھے بڑا کھنور بنا دیا تھا۔ میں نے زندگی اتنی گہری بحثیں نہیں دیکھیں۔ سو مجھے بھی محبت کرنی نہیں آتی تم اچھی لگتی رہیں مگر اسے میں محض اچھا لگنا ہی سمجھتا رہا۔ مگر جب تم میری دسوس سے باہر ہو گئیں تو مجھے لگا کہ جیسے میں اپنی جتنی متاع سے دست بردار ہو چکا ہوں۔ اندر سے بالکل خالی ہو چکا ہوں۔ تم ہند سے منسوب ہوئیں تو مجھے اپنے اندر کے انابرست مرد سے نفرت ہونے لگی کہ اس کے ذمے میں میں نے تمہیں منوایا ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ..... انصافیتوں کے درمیان آجائے تو بڑے فاصلے لے کر آتی ہے۔ انادو محبت ایک دل میں بھلا کیسے ہو سکتی ہیں۔“ اس نے کہتے کہتے سر اٹھایا تو گھبرا گیا وہ رونے جا رہی تھی۔ آنسو تو اسے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کے دل میں تیرا سا پوسٹ ہو

”گھر..... دشمن اور ادا بہت پریشان ہیں انہیں تسلی تو دے دوں کہ آپ کی پوتی قابو میں آ چکی ہے۔“
اس کے انداز اور بات پر اسے ہنسی تو بہت آئی مگر مصنوعی خفگی سے گھورنے لگی پھر رنج و غم سر جھکاتے ہوئے بولی۔

”مجھے شرم آ رہی ہے عرا“
”بالکل آئی چاہئے۔ یہ تو اچھی بات ہے شرم کب بری چیز ہے۔“
وہ اس کی قطعی نسن رہا تھا اور تیور دلا میں آ کر گاڑی روک دی۔

عینہ کو دشمن اور اماں کے حیران اور خوش گوار وجود کے پاس چھوڑ کر وہ خود تیزی سے اپنے کمرے میں آیا اور فون سنڈیک کی طرف بڑھا کر کھنٹی جینج اٹھی۔ دوسری طرف فہد تھا۔ وہ ایک کھری سانس بھر کر رہ گیا۔

”میں ابھی تمہیں ہی کال کرنے والا تھا۔“ وہ ریسور اٹھا کر وہیں صوفے پر لیٹنے کے لیے ہلکا سا بیٹھ گیا اس کی بات پر اور کچھ کچھ بکھی بکھاٹ پر فہد نے زور سے سٹی بجائی۔

”اس کا مطلب ہے نیا پار ہو گئی مبارک ہو دوست۔ ویسے بڑے دن لگا دینے ایک کمزوری لڑکی تم جیسے چھ فٹ کے مرد کے قابو میں نہ آ سکی۔ جج۔ میاں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔“

”معاملہ طاقت کا ہوتا تو بس لمحہ کی بات ہوتی مگر یہاں دل کا معاملہ تھا۔ جذبول اور احساسات کے زور پر جیتا جاتا تھا یار۔“ وہ اس کی بات پر محفوظ ہو کر خوش گوار ہنسی کے ساتھ بولا۔ اس کے لہجے کی تازگی سے ہی فہد اس کی خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔ پھر بولا۔

”بڑے خوش ہو مگر ادھر میرے لئے تو سوچو میں ایک آدھ کچر لگانا چاہتا ہوں مگر حالات سے باخبر کرو کہ کسی طرح خوشی کا سب سے ’ای‘ تو شاید مجھے گھر میں مٹھنے بھی نہ دیں گی۔ خیالی لیزا! تو یقیناً دھماکا ہی کر ڈالا ہوگا۔“

”ایسا یاد سنا وہ بے ساختہ ہنسا۔“ اب جج کی لیزا اڑھوڑ کر لے آؤ۔ کس نے روکا ہے۔ اس ڈرامے کو حقیقت کا روپ دے ہی دو۔“ اس نے چڑایا اور وہ اٹنی چڑ کر چیخا تھا۔

”سوری.... سوری عینہ۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“ اس نے جلدی سے ٹیبلٹس سے چند ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے مگر وہ انہیں تھانے کی بجائے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے ہمیشہ کے لئے کھودینے کا احساس تو اسے بھی زندگی کی لذتوں اور خوشیوں سے عمر بھر کے لئے محروم کر رہا تھا۔ اب تو وہ بھی اسے کھودینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے چہرے پر پشیمانی اور پشیمانی اس کے دل پر ضربیں لگانے لگیں۔ وہ بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر بچوں کی طرح بھل بھل رو پڑی۔

✓ - عمر۔ میں بھی تھک چکی ہوں۔ مجھے سیٹ لیجے میں کھگر گئی ہوں اور جانتی ہوں آپ کے علاوہ مجھے کوئی نہیں سیٹ لگے گا۔ میرے دل میں آپ کے علاوہ کسی کوئی آیا نہ آ سکے گا۔“ وہ اپنے اندر کی ساری تھکن اتار دینا چاہتی تھی۔

جو بھاگتے بھاگتے تھک جاتیں

وہ سائے رک بھی سکتے ہیں

چلو توڑو قسم اقرار کرو

ہم دونوں جھک بھی سکتے ہیں

عمر اسے کتنی دیر بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر جب اس نے روتے روتے سنا ہوا اسے ہنگی ہنگی خوش گوار اور یقین دلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تو وہ سرور سا ہو گیا۔

یہ مسکراہٹ اچالہ بن کر اس کے اندر میرے کو کاٹنے لگی تھی۔ اس نے بھرپور ہنسی اور دلی آمادگی کے ساتھ اور تمام تر جذبول کے ساتھ اس کا ہاتھ چھو پتیا تو اس کے رخساروں پر شفقت پھوٹ پڑی۔ وہ اسکول کر ل کی طرح خود میں مٹ گئی۔

وہ بے حد مسرور انداز میں گاڑی تیور دلا بیگنا لگا۔ وہ گھبرا گئی۔

”کیا کیا کر رہے ہیں آپ۔ کہاں جا رہے ہیں؟“

”اچھا بابا.... کچھ سوچتے ہیں کہ کس طرح اس ڈرامے کا ڈراپ سین کیا جائے۔“ اس نے مزید کہا کہ اچانک اسکی نظریں ثمن اور عینہ پر پڑیں جو دروازے پر کھڑی اسے خون خوار نظروں سے گھور رہی تھیں۔ بھر عینہ نے جھٹکے سے ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

عمر ہونٹ بھیج کر مسکراہٹ دبائے ثمن سے نظریں چرانے لگا جو مصنوعی غصے سے اسے گھورے جا رہی تھی۔

”چنیز... بے ایمان۔“ عینہ فون پر فہد پر الٹ پڑی اور فہد عمر کی بجائے عینہ کی آواز سن کر شیشا گیا۔

”تو دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔“ وہ چلائی دوسرے طرف فہد کا قبضہ بر جستہ تھا۔ ”مجبوری تھی۔ تم کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھیں اور عمر صاحب کی صورت پر مجھے رحم آنے جا رہا تھا۔ ہائے ہائے محبت بھی کس کس طرح ذلیل اور خوار کرتی ہے اچھے خاصے مرد کو۔ اور سواب تمہیں خبر ہو چکی ہے تو میرے لئے میدان صاف کر دو تاکہ میں آسکوں۔“

”ہرگز نہیں۔ اب ہم گوری بھابی کے ہمراہ ہی تمہیں اتارنے دیں گے اپنی سر زمین پر۔“

”ہاں خواہ میں ان نازنیوں کے ناز اٹھانے میں مارا جاؤں۔“ اس نے جل بھن کر ریسیور رکھ دیا تھا عینہ ہستے ہوئے پٹلی پھر ثمن کی طرف بڑھی اور بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”دکھا آپ نے آنٹی، کس کس طرح ہم معصوموں کو دھوکا دیتے ہیں یہ مرد۔“ اس کی بگھڑی جیسے ہونٹوں پر کھل کھلا ہتھی اور چہرے پر تازگی۔ ثمن نے اسے پلٹایا ہوا تھا۔

عمر کے لب بھی مسکراہٹ کو چھو گئے۔

اختتام

مکملے قریش

تیری طلب سب سے اٹھائے

آپ کی ہر طرف